ناول

# درد کی نہر

کرشن چندر

ناشر:۔ ایشیا پبلشرز۔ ۵ بہار گوالین

تیس ہزاری دِلّی نمبر۶

---

لائبریری (مکمّل) ایڈیشن

قیمت:۔ چار روپے

دسمبر ۱۹۶۳ء

طابع:۔ دِلّی پرنٹنگ ورکس دھلی

دنیا کو دیکھنے کا ایک طریقہ ہوائی جہاز سے بھی ہے۔ ہوائی جہاز سے اگر پالن گڑھ کے علاقے کو دیکھا جائے، تو مشرق کی طرف ایک اونچے ٹیلے پر پالن گڑھ کے ٹھاکروں کی حویلی نظر آئے گی اور حویلی سے پرے بنجر اور ویران کھورے کھورے کھیت دکھائی دیں گے۔ کھیتوں سے پرے چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا ایک سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس سلسلے کی ایک چوٹی پر جو پالن گڑھ کے قریب نظر آتی ہے دھن تال کا بند ہے۔ اور دور سے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ایک چھوٹی سی کٹوری میں پانی لبالب بھرا ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے چاروں طرف بنجر پیاسی دھرتی ہے۔ اور بیچ میں ایک اونچی ہتھیلی پر پانی رکھا ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی ابھی یہ ہتھیلی مٹھی کی طرح بند ہو جائے گی اور پانی غائب ہو جائے گا۔ کبھی کبھی زمین کے بہت سے خدشے آسمان سے نظر آتے ہیں۔

حویلی کے پیچھے اونچے نیچے ٹیلوں کی اوٹ میں دھومی ندی بہتی ہے۔ یہ ندی شمال کی پہاڑیوں سے نکلتی ہوئی، جنگلوں میں سے بہتی ہوئی، پالن گڑھ

کے علاقے کو چھوتی ہوئی مشرقی میدانوں کی طرف گھوم جاتی ہے۔ اوپر ہوائی جہاز سے یہ ندی بالکل پنسل کی لکیر کی طرح باریک پتلی اور ٹیڑھی میڑھی نظر آتی ہے۔ جیسے کسی بھولے بچّے نے کاغذ پر ایک ٹیڑھی لکیر کھینچ دی ہو۔ جو پالن گڈھ کے مقام سے یکایک پلٹ کر دوسری سمت چلی گئی ہو۔ کبھی کبھی پالن گڈھ کے روکھے سوکھے کھیتوں کو دیکھ کر یہ شدید احساس ہوتا ہے کہ شاید خدا کی مرضی میں اور ایک بچّے کی مرضی میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ لکیر ادھر نہ کھینچ دی اُدھر کھینچ دی۔

پالن گڈھ سے ندی تک ایک کچا راستہ گیا ہے۔ ندی کے پار جنگلوں اور جنگلوں سے اتر کر میدانوں میں ایک موٹر روڈ جا رہی ہے۔ نیلی پنسل کی لکیر، جو ایک بڑے سُرخ نقطے پر ختم ہوتی ہے۔ یہ رمن بھائی پٹیل رائے شوگر مل کی سُرخ عمارت ہے۔ اس عمارت کے احاطے میں ریل کی پٹری دور اندر تک گئی ہے۔ کھلونوں کی طرح ڈبے دھوپ میں چمک رہے ہیں اور پرے میدانوں میں ایک مال گاڑی گویا شکر کا ایک لمبا چمچہ ہے، جسے ابھی اٹھا کر آپ کے پیالے کی طرف بڑھا کر ایک باریک نسوانی آواز آپ سے پوچھے گی۔

"کتنی شکر۔۔؟" مگر شکر کھیت سے چائے کی پیالی تک درد کا ایک بہت بڑا فاصلہ طے کرتی ہے، اور اس درد کو دیکھنے کے لئے ہوائی جہاز کوئی مدد نہیں کرتا۔ اس درد کو دیکھنے کے لئے زمین سے بہت قریب آنا پڑتا ہے۔

دھرتی کو چھو کر ہی معلوم ہو سکتا ہے کہ زمین کتنی گرم ہے اور اس کے سوکھے ہونٹوں پر ہاتھ پھیر کر معلوم ہو سکتا ہے اس کے لب کتنے پیاسے ہیں۔ چینی کے نازک بولوں میں پڑے ہوئے شوگر کے شفاف دانے کو دیکھ کر جن پر کسی نازک انگلی میں نکلے ہیرے کے نگینے کی چھوٹ پڑ رہی ہے کیسے اس لہو کا اندازہ ہو سکتا ہے جس سے یہ شکر کشید کی گئی ہے۔

دھومی ندی کے قریب ایک بلند ٹیلے پر کھڑے ہو کر دلیپ نے اپنے چاروں طرف دیکھا اور اس کی نگاہ جنگلوں سے گھوم کر اونچے پہاڑی سلسلوں پر جاتی ہوئی دھن تال کا احاطہ کرتی ہوئی، نیچے اُتر کر ان سرسبز اور گلزار کھیتوں میں گھومنے لگی جن میں آبپاشی کی نہروں کا جال پھیلا ہوا تھا اور اسے آج سے بہت برس پہلے کے بہت پرانے دن یاد آئے۔ جب وہ اس قدر اکیلا نہ تھا۔

(۲)

سکھو کے بیلوں کی جوڑی ہل کے آگے جُتی مایوسی سے سر جھکائے کھڑی تھی۔ کھیتوں کی دھرتی میں سوکھ، سوکھ کر دراڑیں پڑ گئیں تھیں۔ دور اوپر آسمان میں سورج کسی پیاسے کے دل کی طرح دھک، دھک کر رہا تھا۔ سکھو نے اوپر نیچے چاروں طرف دیکھ کر کھیتوں کے بیچ کھڑے ہو کر بڑی مایوسی سے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور اپنی نوجوان بیوی سجری سے کہنے لگا۔

"اگر اس سال بھی بارش نہ ہوئی تو کال پڑ جائے گا۔ سب بھوکوں مر جائیں گے"

سانولی، سلونی سجری اپنے بلکتے ہوئے بچے کو کندھے سے لگائے تھپک تھپک کر بولی۔

"دھن تال سے پانی کیوں نہیں لیتے، سیٹھ نے تو بول رکھا ہے، جس سال بارش نہ ہو، کسانوں کو تال سے مفت پانی دے دیا جائے گا۔ اور گنے کی فصل سے اس پانی کی قیمت کاٹ لی جائے گی۔"

"سیٹھ نے تو بول رکھا ہے، مگر سیٹھ تو کبھی تال پر نہیں آتے۔ تال سے تو تال کا بابو ہی پانی دیتا ہے اور اس وقت تک نہیں دیتا جب تک اس کی مٹھی گرم نہ

ہو۔ اور یہاں زہر کھانے کو پیسہ نہیں ہے۔"

"اس کے پاؤں پکڑ لینا اس کے دل میں دیا آجائے گی!"

"نہیں سجری، جب دل میں پیسے کا لوبھ آجاتا ہے، تو دل سے دیا نکل جاتی ہے۔"

"اس میں اس کا کیا جائے گا؟" سجری حیران ہو کر بولی۔ "پانی ہی تو دے گا۔ کون سے ہیرے موتی ہم کو دے دے گا۔"

"تال کا بابو اچھی طرح جانتا ہے، کہ اس سمئے تال کی جو ایک بوند ہے، وہ ہمارے لئے ہیرا ہے، موتی ہے۔"

سجری نے آہ بھر کر آسمان کو دیکھا۔ جہاں بادلوں کا کہیں پر ایک ٹکڑا نہ تھا پھر اس نے اپنے چاروں طرف، اپنے ویران کھیتوں کو دیکھا۔ پھر وہ اپنے بچے کی کلائی سے چاندی کے کڑے اتارنے لگی۔

"کیا کرتی ہو؟" سکھو گھبرا کر بولا۔ "کتنے شوق سے تو نے بچے کے لئے چاندی کے کڑے بنوائے تھے۔"

"میری کوکھ کا چاند سلامت رہے، چاندی کے کڑے پھر آجائیں گے!"

بچہ زور زور سے بلکنے لگا۔ سجری کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مگر اس نے بچے کے ہاتھوں سے دونوں کڑے اتار لئے اور انہیں اپنے شوہر کے ہاتھوں میں دے دیئے۔ پھر یکایک زور سے اپنے شوہر کے گلے سے چمٹ کر رونے لگی۔ سکھو خود بھی روتے روتے بولا۔

"روتی کیوں ہے پگلی! اس سنسار میں پانی مہنگا ہے لیکن آنسو بہت سستے ہیں۔ ایسے سنسار میں رونے سے کیا فائدہ؟"

سکھو نے زور سے چاندی کے کڑے اپنی مٹھی میں داب لئے۔ زور کا جھٹکا

دے کر اس نے بجری کو اپنے آپ سے الگ کیا اور وہاں سے بھاگ گیا۔ بجری اپنے بچے کو لے کر چھپرے میں بھاگ گئی۔ صرف دونوں بیل تپتی ہوئی دھرتی پر کھڑے اپنے کان پھٹپھٹاتے رہے۔!

(۳)

سکھو دھن تال میڈورکس کی طرف جا رہا تھا۔ راستے کی چڑھائی چڑھنے سے پہلے اس نے پیپل کے پیڑ کے نیچے ایک پکے چبوترے میں پالن گڑھ کے زمین دار ٹھاکر کنور سنگھ کو چاندی کی نال منہ میں دبائے حقہ پیتے ہوئے گاؤں کے مہاجن کرپاشاہ کے ساتھ شطرنج کھیلتے ہوئے دیکھا تو صاف کنی کاٹ گیا، اور سیدھا راستہ چھوڑ کر گھاٹی گھاٹی ہو لیا۔ اگر ٹھاکر کی نظر اس پر پڑ گئی تو فوراً کسی بے گار میں الجھا دے گا۔ خیریت ہوئی کہ ٹھاکر کنور سنگھ نے اسے نہیں دیکھا اور سکھو اس کی پشت ہی سے گھاٹی کے موڑ پر غائب ہو گیا۔

ٹھاکر کنور سنگھ چوڑا چکلا کھڑے باڑی کا چھ فٹ دو انچ کا راجپوت تھا۔ اس کے جسم سے اس کے پرکھوں کی شکتی اور طاقت کی ایک جھلک اب بھی دکھائی دے جاتی تھی۔ اس کا ماتھا چوڑا اور فراخ تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں غلافی تھیں۔ رنگ گندمی اور دمکتا ہوا تھا اور ہونٹوں پر گلہری نما مونچھیں تھیں۔ گال صدیوں کے عیش و آرام سے پھولے ہوئے تھے اور ٹھوڑی کے نیچے بھاری بھاری دو، تین تہیں پڑتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا چوڑا چکلا چہرا گوشت کے دو تین گدیلوں پر رکھا ہوا ہے۔ ٹھاکر کنور سنگھ کو شطرنج سے اتنا ہی عشق تھا جتنا کہ جنگجو بادشاہ کو میدانِ جنگ سے ہوتا ہے۔ سوچ سوچ کر ٹھاکر کنور سنگھ نے

ایک پیادہ آگے بڑھایا اور بولا۔

"دیکھا مہاجن! یہ ہمارے مورچے کی گھات ہے۔"

کرپا شاہ بھی ٹھاکر کی طرح لمبا تڑنگا تھا۔ مگر بے حد دبلا پتلا تھا اس نے آہستہ سے اپنی چال چل کر کہا۔

"ٹھاکر شہ بچاؤ ورنہ بازی مات ہے۔"

اتنے میں ٹھاکر کے پیچھے کھڑے ہوئے مصاحب رام سنگھ نے کہا "شاید ڈپٹی صاحب تال پر مرغابیوں کے شکار کے لئے جا رہے ہیں۔"

ٹھاکر اور مہاجن دونوں نے جلدی سے نگاہ اٹھا کر ادھر دیکھا جدھر مصاحب نے اشارہ کیا تھا۔ دیکھتے ہی دونوں مؤدب کھڑے ہو گئے۔ بلاشبہ علاقے کا ڈپٹی کلکٹر دوسرے انگریز مردوں اور عورتوں کے ساتھ گھوڑوں پر سوار دیسی اہلکاروں کے ہمراہ چڑھائی چڑھتے ہوئے دھن تال کی جانب جا رہا تھا۔ مہاجن اور ٹھاکر دونوں نے اٹھ کر فرشی سلام کیا۔ ایک بار نہیں، کئی بار۔ اور وہ اس وقت تک سلام کرتے رہے جب تک آخری گھڑ سوار ان کے سامنے سے گذر نہیں گیا۔ پھر وہ دونوں شطرنج کھیلنے کے لئے بیٹھ گئے اور مہاجن بولا۔

"سرکار میں نے سنا ہے کہ آج شام تک چیف کمشنر ٹھامپسن صاحب بہادر بھی شکار کے لئے آنے والے ہیں اور سیٹھ دھن پت رائے کی کوٹھی پر قیام فرمائیں گے۔!"

ٹھاکر کنور سنگھ نے بڑے فخر سے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا اور بولا۔

"ہاں میرے پاس بھی ان کا خط آیا ہے میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ میں ان کے اعزاز میں ایک شاندار ریسپشن دے رہا ہوں۔"

"جی ہاں حضور نے فرمایا تو تھا۔"

"تو کیا تم اس سلسلے میں سیٹھ دھن پت رائے کے ہاں گئے تھے؟" زمیندار نے پوچھا۔

"گیا تھا ٹھاکر صاحب!"

"پیسے لائے؟"

"جی!"

"کتنے؟"

"بیس ہزار لایا ہوں۔"

"مگر ہم نے تو پچیس مانگے تھے!"

"سیٹھ بولے اس وقت اس سے زیادہ کا بندوبست نہیں ہو سکتا۔"

ٹھاکر نے ہنس کر کہا۔ "تم مہاجن ہو کر پانچ ہزار سے زیادہ کا بندوبست نہیں کر سکتے۔ وہ مِل مالک ہو کر پچیس ہزار سے زیادہ دے نہیں سکتا۔ تو ہم غریب زمیندار لوگ کہاں جائیں؟"

"میں تو خیر آپ کی رعایا ہوں۔" مہاجن نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "اور آپ کی رعایا کے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آئے گا؟ مگر سیٹھ دھن پت رائے کی بات دوسری ہے۔ اسے زیادہ مجبور بھی تو نہیں کیا جا سکتا!"

"پیسے نکالو!"

"پہلے چال تو چلیے۔"

"وہ بعد میں ہوتی رہے گی۔"

"یہ لیجیے بیس ہزار۔"

ٹھاکر نے نوٹ کی گڈیاں رام سنگھ کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "رام سنگھ ان کو گنو۔"

جب رام سنگھ نوٹ گننے میں مصروف تھا تو مہاجن نے اپنی جیب سے کچھ کاغذات نکال کر کہا۔ "ان پر آپ کے دستخط چاہیئے۔"

"کیسے کاغذ ہیں؟"

"حویلی کا گروی نامہ ہے!"

"گروی نامہ! محض بیس ہزار روپئے کے لئے؟ کیا سمجھ رکھا ہے سیٹھ دھن پت رائے نے ہمیں۔ ؟ وہ اگر شوگر مل کا مالک ہے تو ہم بھی پالن گڑھ کے زمیندار ہیں۔"

"ان داتا! پالن ہار! وہ تو آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ مگر سیٹھ جی کہتے ہیں یہ کاغذات تو محض خانہ پری کے لئے ہیں۔"

رام سنگھ نے نوٹ گننے گننے سر اٹھا کر مہاجن کی طرف دیکھا تو مہاجن نے موقع دیکھ کر اسے آنکھ ماری۔ مصاحب نے فوراً مکھن لگاتے ہوئے کہا۔

"سرکار اس گروی نامہ کا آپ کو فکر کیا ہے؟ زمینداری سلامت رہے، انہیں کھیتوں کی کمائی سے ایسی ایسی دس حویلیاں کھڑی ہو سکتی ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" ٹھاکر کنور سنگھ نے مسکرا کر کہا۔ "کہاں کہاں دستخط کرنا ہیں؟"

مہاجن بتانے لگا۔ ٹھاکر دستخط کرنے لگے۔ اتنے میں ٹھائیں، ٹھائیں دو تین بار گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ ٹھاکر صاحب کا ہاتھ کانپ گیا اور کاغذ ان کے ہاتھ سے گر پڑے۔ ان کا چہرہ چند لمحوں کے لئے فق ہو گیا۔ پھر ان کے مصاحب رام سنگھ نے اوپر دھن تال کی طرف جہاں سے گولی چلنے کی آواز آئی تھی دیکھ کر کہا۔ "کچھ نہیں مرغابیوں کا شکار ہو رہا ہے۔"

ایکدم خون ٹھاکر کنور سنگھ کے رخساروں پر لوٹ آیا اور وہ مسکرا کر کاغذ اٹھا کر دستخط کرنے لگے۔

دھن تال کے بندھ پر انگریز حاکم کشتیوں میں سوار ہو کر مرغابیوں کا شکار کر رہے تھے۔ اور بندھ کی ایک دیوار پر کھڑا بابو بھیکو رام انگریز عورتوں کی نشانہ بازی پر حیران ہو رہا تھا۔ انگریز عورتیں اس قدر شفاف چٹی کیسے ہوتی ہیں۔ وہ ہندوستانی عورتوں سے اس قدر تیز کیسے چل لیتی ہیں۔ وہ اس قدر عمدہ نشانہ کیسے لگا لیتی ہیں۔ کیا وہ واقعی اپنے پیٹ میں بچہ رکھ کر جنتی ہیں۔ یا نو ماہ بعد کوئی سکلنگ ہوا میں اڑتا ہوا آتا ہے اور ان کے بستر پر ایک بچہ چھوڑ جاتا ہے بابو بھیکا رام نے واقعی آج تک کسی انگریز عورت کا پیٹ بڑھا ہوا نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے اسے بڑی حیرت تھی۔ کہ یہ عورتیں کب اور کیسے بچے جنتی ہیں۔ کبھی کبھی اس کے دل میں خیال آتا تھا۔ ممکن ہے، یہ انگریز عورتیں اپنے لباس کے اندر عورتیں ہی نہ ہوں۔

یکایک بھیکو رام کو سکھو کی آواز نے چونکا دیا اور پہلے لمحہ میں وہ اس طرح کانپ گیا، گویا اسے کسی نے چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا ہو۔ دوسرے لمحہ جب اس نے سکھو کو دیکھا تو اسے اطمینان ہو گیا اور اس نے تال کے بابو کی پیشہ ورانہ خشونت اپنے چہرے پر لا کر اور اپنے لہجہ میں گھول کر بڑی سختی سے کہا۔ "کیا ہے؟"

"کھیت سوکھے ہیں پانی چاہیئے۔"

"نہیں ملے گا۔"

"حجور سیٹھ کا تو حکم ہے پھر کیوں نہیں ملے گا؟"

"تو جاؤ سیٹھ کے پاس فریاد کرو۔ دیکھتے نہیں ہو صاحب بہادر مرغابیوں کا شکار کر رہے ہیں اگر انہیں دنوں میں کسانوں کو پانی دوں گا اور تال کا پانی کم ہو جائے گا تو صاحب بہادر لوگوں کے لئے شکار کی آس کم ہو جائے گی۔"

سکھو بولا۔ "مگر حجور شکار کی آس سے ہمارے کھیتوں کی پیاس زیادہ ہے۔"

"کہہ جو دیا پانی نہیں ملے گا!" بھیکو رام نے ڈپٹ کر کہا اور کون اس بحث میں جائے کہ بھیکو رام ایک کمینہ آدمی تھا۔ گذشتہ پانچ پشتوں سے اس کے خاندان نے کبھی فراغت نہ دیکھی تھی۔ اس بات کا اثر بچّے کی فطرت، اس کے جسم اور روح پر بھی پڑتا ہے۔ دیکھنے میں بھیکو ایسا لگتا تھا گویا وہ کوڑے کرکٹ سے بنایا گیا ہے اس کے جسم میں کسی انسان کی نہیں۔ کاک ریچ کی روح ہے۔ اس کا لباس تک کمینہ تھا۔ تھیلوں کی طرح لٹکتی ہوئی خالی پتلون اور کینوس کے جوتے ربڑ والے بے آواز اور گھسے ہوئے اور نوک سے پھٹے ہوئے اور بدنما پاؤں کا انگوٹھا باہر نکلا ہوا اور ہاتھ کی لجلجی انگلیوں کے ناخن بڑھے ہوئے۔ اسے دیکھ کر سکھو کے دل میں خیال آیا کہ اسے پاؤں کے نیچے رکھ کر مسل دے۔ مگر وہ گڑگڑا کر بولا۔ "حجور پانی دو!"

اتنا کہہ کر سکھو نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر اس کی مٹھی کھول دی۔ اس کی ہتھیلی پر چاندی کے دو کڑے رکھے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر بھیکو رام کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور چہرے کی تلخی کسی قدر کم ہوئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر فوراً چاندی کے کڑے اپنے ہاتھ میں دبوچ کر اپنی جیب میں ڈال لئے اور پھر فوراً اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر آہستہ سے بولا۔

"اچھا کل آجاؤ۔ پانی مل جائے گا۔"

دوسرے دن جب دلیپ چھٹیاں گذار کر واپس ایگری کلچرل کالج کو جا رہا تھا اس نے سکھو کو سر جھکائے نالی کھود کھود کر اپنے کھیتوں میں پانی لاتے دیکھا۔ سکھو

اس قدر تیزی سے کام کر رہا تھا گویا اگر اس نے آج ہی اپنے سارے کھیتوں کو پانی نہ دیا تو قیامت آجائے گی۔

آگے چل کر اس نے ایک اور کسان کو دیکھا جس کا نام جبرا تھا۔ وہ کسان بھی پوری تندہی اور مشقت سے اپنے کھیتوں میں نالیاں بنا رہا تھا۔ اس تیزی اور عجلت سے گویا کسی بندوق کا کندہ اس کی پیٹھ پر ہو اور وہ اسے کٹوکے دے دے کر اس سے کام کرا رہا ہو۔ اور دلیپ کا دماغ جھنجنی صدیوں پیچھے کو گھوم گیا اور اس نے سوچا کہ اس ظلم سے جو نظر نہیں آتا ہے وہ ظلم کہیں بہتر ہے جو نظر آتا ہے۔ کیونکہ آدمی اسے نشانہ بنا سکتا ہے۔ مگر آج کل کا ظلم بہت ہی شائستہ اور بلاواسطہ قسم کا ہوتا ہے۔ پہلے زمانے میں بادشاہ دربار میں بلا لیتے تھے اور قتل کر دیتے تھے۔ یا گاؤں میں گھس جاتے تھے اور گاؤں جلا دیتے تھے۔ بات سمجھ میں آتی تھی۔ مگر آج کل کے بادشاہ پارلیمنٹ ہاؤس میں بیٹھے ہیں۔ عوام کے لئے لڑتے ہیں۔ اور ہزاروں میل دور بیٹھ کر نظر نہ آنے والی قانونی نلکیوں سے دھیرے دھیرے عوام کا خون ایسے چوستے ہیں کہ آخر میں صرف ہڈیوں کے پنجر رہ جاتے ہیں اور دھرتی سوکھ جاتی ہے۔

سکھو یکایک چونک پڑا۔ کیونکہ یکایک پانی آنا بند ہو گیا تھا۔ پانی اس کے کھیتوں میں نہیں آرہا تھا۔ نالی آدھے راستے تک گیلی تھی پھر سوکھ گئی تھی۔ سر سے پاؤں تک اس کے جسم میں پسینہ آگیا اور وہ پیچھے مڑ کر بھاگا بھاگا نالی کے سرے تک گیا۔ جہاں سے پانی آرہا تھا۔ وہاں جامن کے پیڑوں کی اوٹ میں جبرا کھڑا تھا۔ اور جبرے نے پانی توڑ کر اپنے کھیتوں کو دے دیا تھا۔ سکھو کا سارا جسم غصے سے کانپ گیا۔ اس نے چلا کر کہا۔

"تم نے میرا پانی کیوں لیا؟"

جیرا ہانپتے ہانپتے بولا۔ "پانی میرا ہے۔"
"نہیں میرا ہے میں نے کل تال والے بابو کو اپنے بچے کے کپڑے دے کر یہ پانی لیا ہے۔"

جیرا نے کہا "خبردار جو نالی کو ہاتھ لگایا۔ میں نے پانی کے لئے اپنی بیوی کا زیور دیا ہے۔"

سکھو نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔ "یہ پانی پہلے میرے کھیتوں میں جائے گا!"
"نہیں، پہلے میرے کھیتوں میں جائے گا۔!" جیرا تن کر بولا۔

اگر کوئی عقلمند تقدیر ہوتی تو وہ ان دونوں احمقوں کو یہیں روک دیتی۔ اور ان سے کہتی۔ اگر پانی کی نالی ہے، تو آدھے وقت ایک کسان پانی لے لے۔ آدھے وقت دوسرا۔ دن کو سکھو پانی لے لے اور رات کو جیرا۔ یا آدھے دن جیرا پانی لے لے اور آدھے دن سکھو۔ یا پانی کی نالیاں دو کیوں نہیں ہیں۔ اور اگر دو ہیں تو تال سپروائزر نے دونوں نالیوں میں پانی کیوں نہیں چھوڑا۔ اور اگر نالی ایک ہے یا پانی کم ہے تو اس نے ایک دن ایک کسان کو پانی دیا ہوتا! دوسرے دن دوسرے کو۔ اور آخر تال کا پانی انگریز حاکموں کے مرغابیوں کے شکار کے لئے تو ہے نہیں۔ پھر ایک ہی دن ایک ہی وقت پالن گڈھ کے کسانوں کو پانی کیوں نہیں دے دیا جاتا؟

مگر ان لوگوں کی تقدیر عقلمند کیسے ہو گی جنہیں دنوں نہیں، مہینوں بھوکا اور پیاسا رکھ کر یکایک پانی کا گلاس ان کے سامنے رکھ دیا جائے، صرف ایک گلاس، دو آدمیوں کے درمیان، اس امر کی کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ پیاس سے پاگل دو انسان نارمل انسانوں کا سا سلوک ایک دوسرے سے کریں گے؟ اس لئے پہلے سکھو نے کدال اٹھائی، یا جیرے نے اور کون کس کے قتل

کے لئے آگے بڑھا۔ یہ قانونی بحث بالکل بیکار ہے۔ قانون سماج کا ایک سطحی پوسٹ مارٹم ہے۔ جو اس کی جِلد سے دو انچ گہرا بھی نہیں جاتا۔ تہوں کو کھول کر ہڈیوں تک پہونچنے کی قوت کس قانون میں ہے؟

اس لئے یہ منظر یہیں نہیں رکا اور ریبسن کے کسی المیئے کی طرح لامحالہ اپنے اختتام کو پہنچا۔ اس اختتام کو کوئی نہیں روک سکتا تھا اور اس اختتام کا فیصلہ صبح ہی بابو بھیکا رام کر چکا تھا اور بابو بھیکا رام سے پہلے سیٹھ دھن پت رائے اور سیٹھ دھنپت رائے سے پہلے ضلع کا ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی کلکٹر سے پہلے صوبے کا گورنر اور صوبے کے گورنر سے پہلے دہلی کا وائسرائے اور دہلی کے وائسرائے سے پہلے لندن کی پارلیمنٹ جس میں بیوی بچوں والے مہذب اور شریف لوگ شریک ہوئے اور انتہائی متانت اور شائستگی سے اس ظلم اور قتل کو ترتیب دیتے ہیں۔ کس قانون میں ہمت ہے کہ ان سب کو پکڑے اور ہتھکڑی لگا کر عدالت میں حاضر کر دے؟

اس لئے کہ الیں ہوا میں لہرائیں اور چیخیں فضا میں بلند ہوئیں اور پانی نے صرف اتنا دیکھا کہ سکھو کا جسم نالی کے کنارے گرا اور اس کا ہات لڑھک کر پانی میں جا گرا۔ اور خون بہہ بہہ کر پانی میں ملنے لگا۔ اور دور دور تک سکھو کا خون نالی کے پانی میں گھل مل کر باجرے کے کھیتوں کو سیراب کرتا گیا۔

بھائیں!

اور اوپر ایک انگریز نے بندوق اٹھائی اور دھن تال کی فضاؤں میں چکراتی ہوئی مرغابی زخمی ہو کر پانی میں گری اور لہو کی ایک سرخ لکیر دور تک پانی میں کھنچ گئی۔ اور ڈپٹی کلکٹر جگیشن نے چیف کمشنر ٹھامپسن سے کہا "گوڈ شاٹ!"

دلیپ کا سر پانی پر جھک گیا۔ اور اس کی سوچ بچار میں ڈوبی ہوئی آنکھوں نے دور، دور تک کھیتوں میں جانے والی نالیوں میں انسان کے خون کو گھلتے ملتے دیکھا اور اسے یاد آیا۔ چمپارن اور وائیلا۔ باردوس اور نمک کا ستیہ گرہ جنیو اور جلیان والا باغ اور دور دور سے سینکڑوں ہزاروں، نالیاں انسان کے خون کو لے کر آنے لگیں اور پانی اور خون کی پھیلتی ہوئی چادر پر آزادی کا نقشہ ابھرنے لگا۔ اور ابھر ابھر کر واضح ہوتا گیا۔۔۔۔۔۔

اور اب جو اس نے دھوی ندی کے پانیوں سے سر اٹھا کر دیکھا تو اسے ٹیلوں کے اوپر آزادی کا جھنڈا لہراتا ہوا نظر آیا۔ اور اس نے دل ہی دل میں سکھو کے خون کو سلام کیا۔!

حویلی !

بلند ٹیلوں پہ پانچ پشتوں سے کھڑی ہے۔ ہوائی جہاز سے دیکھو، تو یہ حویلی ہزار پائے (OCTOPUS) کی طرح ہر طرف ٹیلوں پہ پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ بیچ کی عمارت گویا ہزار پائے کا مرکزی جسم ہے اور آس پاس بے شمار باہنوں اور ٹانگوں کی طرح اضافی عمارتیں چلی گئی ہیں۔ جن میں بے شمار نوکر خانے ہیں، اصطبل ہے، فیل خانہ ہے (جو اب ویران ہے)، گودام ہیں، اناج کے، روئی کے، گنّے کے اور اسباب کے، گائے بھینسوں اور بکریوں کے مویشی خانے ہیں۔ یہ محنت والے ہات ہیں۔ جو ہزار پائے کے مرکزی جسم کو خون پہونچاتے ہیں اور جو پشت در پشت خون پی پی کر موٹا ہوتا رہا ہے۔ سال بہ سال یہ حویلی، پچھلی پشتوں سے بڑی ہوتی رہی ہے۔ اس کے کمروں، دالانوں، صحنچوں، برآمدوں، شہ نشینوں اور برجیوں میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اور دور فاصلے پر ایسی ایک نہیں سینکڑوں، ہزاروں حویلیاں، بڑے بڑے ہزار پایوں کی طرح دیہاتی چھپروں اور کھیتوں کے درمیان بکھری نظر آتی ہیں۔ اور ان کا اور چھپروں کا رشتہ کچھ اس طرح کا معلوم

ہوتا ہے۔ جیسا چھوٹی مچھلیوں کا بڑے اکٹوپس سے ہوتا ہے۔ یہ بات اونچائی سے میدانوں اور گھاٹیوں اور وادیوں کو دیکھنے سے بہت جلد سمجھ میں آجاتی ہے جو غالباً دس کتابیں پڑھنے کے باوجود سمجھ میں نہ آئے گی کہ یہ چھپر اتنے حقیر کیوں ہیں ؟ اور یہ اکٹوپس اتنا موٹا کیوں ہے۔ ؟ دور اوپر دیکھنے سے یہ دھرتی بھی سمندر کا ایک حصہ معلوم ہوتی ہے۔ جہاں بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل جاتی ہے۔ کھیتوں کا سبزہ، گہرے سبز پانی کی طرح لہریے دار معلوم ہوتا ہے۔ کسانوں کے چھوٹے چھوٹے چھپر فضا میں تیرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور کہیں کہیں فاصلوں پر ٹیلوں سے چمٹی ہوئی یہ موٹی موٹی حویلیاں ہزار پایئے کی طرح شکار کے گھات میں مصروف نظر آتی ہیں۔ ان حویلیوں کو اوپر فضا کی اونچائی سے دیکھ لینا گویا اپنی دیہی زندگی کے گذشتہ سات ہزار سال کی تاریخ کو ایک لمحہ میں سمجھ لینا ہے بڑا ہی حیرت انگیز نظارہ ہوتا ہے یہ۔

آیئے ہوائی جہاز سے نیچے اتریں اور اکٹوپس کے اندر چلیں۔

یہ حویلی کا پھاٹک ہے۔ اکٹوپس کا منہ۔ اندر ایک تاریک چھتی ہوئی ڈیوڑھی ہے۔ جہاں داروغہ جی اور چوکیدار بیٹھے ہوئے حویلی کی نگہبانی کر رہے ہیں۔ یہاں سے دو چھتی ہوئی غلام گردشیں یعنی دو نالیاں دائیں بائیں جاتی ہیں۔ ایک زنانہ ڈیوڑھی کو دوسری مردانہ بیٹھک کو سامنے کھلا صحن ہے۔ اکٹوپس کے پھیپھڑے بڑے پھیپھڑے ہیں۔ بہت کھلا صحن ہے۔ بیچ بیچ میں کہیں کہیں آم، نیم، املی اور جامن کے پیڑ لگے ہیں۔ دائیں طرف لنگر خانے اور رسوئی کے باہر دو کنوئیں ہیں۔ جن سے کہارنیں اور پنہاریاں پانی کھینچ رہی ہیں۔ کیونکہ پانی کے بغیر کوئی جاندار چیز زندہ نہیں رہ سکتی۔

اور اندر چلو۔ اونچی کرسی کی سیڑھیاں چڑھو۔ سامنے حویلی کی مرکزی

عمارت ہے یعنی اکٹوپس کا دل ۔ زندگی اور خون سے دھڑکتا ہوا۔ نوکر خانوں
سے صاف کشید کردہ۔ خون اندر چلا آرہا ہے۔ ہال کا کمرہ روشن اور ہوادار ہے
سیڑھیاں کشادہ اور مضبوط ہیں اور اُن پر پرانے ایرانی قالین بچھے ہوئے ہیں
کہیں سے گانے کی آواز سنائی دے رہی ہے ۔ کہیں سے نسوانی قہقہے آکسیجن
کے فوارے کی طرح چھوٹ رہے ہیں۔ ہال کے کمرے کے زینے پر چڑھتے ہوئے
مضبوطی، توانائی کا احساس ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حویلی کی شہ رگ سے
گذر رہے ہیں۔

پہلی منزل سے گذر جاؤ۔ اور اوپر چڑھو۔ کیونکہ اس دل کے بہت سے
خانے ہیں۔ دوسری منزل پر صاف ایک کمرہ ہے۔ جس کے اوپر حویلی کی سب سے
اونچی برجی ہے اور اس کمرے کے چاروں طرف باریک باریک سرکیوں سے چھنتے
ہوئے برآمدے ہیں اور صبح کی دھوپ آس پاس کی پہاڑیوں کی تازگی لیے ہوئے
روشنیوں اور خوشگوار سایوں کی شطرنجی سی بنا رہی ہے اور اس شطرنجی پر ایک
نوجوان کھلے کالر کی ایک قمیص اور نیلے رنگ کی مخملی جو دھپور پہنے برجی والے کمرے
کی سمت بڑھ رہا ہے!

دلیپ کمرے کی طرف جاتے ہوئے ایک لحظہ رکا۔ اس کے قدموں کی چاپ سن کر ایک باندی نے دروازے سے منہ نکالا۔ اور دلیپ کو دیکھ کر مسکرا دی۔ پھر اس نے گردن کے خم اور چتون کے تیکھے اشارے سے دلیپ کو اندر آنے کی دعوت دی۔

دلیپ قدم بڑھا کر کمرے کے اندر چلا گیا۔

سامنے تخت پر دادی اماں بیٹھی تھیں اور چاندی کے خاصدان سے ایک گلوری اٹھا کر منہ میں رکھ رہی تھیں۔ اسّی سالہ منحنی اور نحیف دادی اماں روئی میں لپٹے ہوئے انگور کے دانے کی طرح بڑی احتیاط سے تخت پر رکھی ہوئی معلوم ہوتی تھیں ان کے چہرے کی رنگت جو جوانی میں زیتونی ہوگی، اب بڑھاپے میں انگوری ہو گئی تھی آنکھیں وہی سنگر ہار راجپوتوں کی سی غلافی۔ رخساروں کی ہڈیاں نمایاں۔ باریک ستواں ناک، اور سکڑا ہوا دہن جو کبھی غنچۂ دہن رہا ہو گا، اور کشیدہ مردانہ ٹھوڑی جو اس نسوانی چہرے کو ایک عجیب طرح کی مضبوطی اور وقار عطا کرتی تھی۔ دلیپ کو دیکھتے ہی دادی اماں کے چہرے پر ایسا تبسم آیا جیسے انگور شبنم میں دُھل گیا۔

دلیپ نے پالاگن کیا۔

"جیتے رہو" کہہ کر دادی اماں نے اپنا لرزتا ہانپتا ہاتھ اٹھا کر اسے دعا دی اور پھر پوچھا "آج سویرے سویرے کہاں جا رہے ہو، دیپو؟"

"ندی پر جا رہا ہوں۔"

"شکار کھیلنے جاؤگے!"

"نہیں دادی ماں، میں ندی کے پانی کا لیول ( دیکھنے جا رہا ہوں۔ ایک عرصے سے سوچ رہا ہوں کہ اگر اس ندی سے ایک چھوٹی سی نہر کاٹ کے۔۔۔۔۔" دلیپ اتنا کہہ کر رک گیا۔ پھر اس نے جودھپوری کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک نقشہ نکالا اور تخت پر بیٹھتے ہوئے اسے دادی اماں کے سامنے بچھا دیا اور سمجھاتے ہوئے بولا

"دیکھئے یہ پالن گڈھ کا نقشہ ہے۔ یہ رہا گاؤں۔۔۔۔۔ یہ ندی۔۔۔۔ یہ حویلی۔۔۔۔ یہ ہمارے کھیت۔۔۔۔ یہ پہاڑی پر دھن تال۔ جہاں سے ہمارے کسان پانی لیتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ شوگر مل ہے۔۔۔۔ یہاں۔۔۔۔ جہاں ریلوے اسٹیشن ہے۔"

"نقشہ تو ٹھیک ہے۔ مگر تم چاہتے کیا ہو؟" دادی اماں نے نقشے پر غور کرتے ہوئے کہا۔

دلیپ بولا۔ "میں چاہتا ہوں کہ دھومی ندی کو اس مقام سے کاٹ دوں۔ اس مقام سے اوپر پہاڑیاں ہیں۔ اس مقام سے نیچے ٹیلے ہیں۔ صرف اس مقام سے ندی کے کناروں کی سطح ہمارے کھیتوں کی سطح کے برابر ہے۔ اگر اس جگہ سے دھومی ندی کو کاٹ کر ایک نہر کھودی جائے تو پھر ہمیں سال بھر پانی کی چنتا نہ رہے گی۔ نہ دھن تال والوں کی خوشامد کرنی پڑے گی۔۔۔۔۔۔ دیکھئے۔۔۔۔ یہ نہر۔۔۔۔ یہاں سے ہوتی ہوئی۔۔۔۔" دلیپ نقشے پر انگلی پھیرتے ہوئے

گویا نہر کا راستہ دادی اماں کو بتاتے ہوئے بولا "یوں جا کر سون کے ٹیلوں سے مڑتی ہوئی، یوں ادھر کھیتوں میں آ جائے گی۔ پھر میں یہاں ایک بہت بڑا زراعتی فارم کھولوں گا۔ ٹریکٹر لاؤں گا۔ نئے بیج اور نئی کھاد استعمال کر کے پالن گڈھ کے چپّے چپّے کو گلزار بنا دوں گا۔"

"تمہارا نقشہ تو ٹھیک ہے مگر کبھی گھر کے نقشے پر بھی غور کیا ہے؟" دادی اماں ایک اداس مسکراہٹ سے تھکے ہوئے مایوس انداز میں بولیں۔

"جب یہ نقشہ ٹھیک ہو جائے گا تو گھر کا نقشہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔" دلیپ نے پُر امید لہجہ میں کہا۔ دادی اماں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ "کیسے بدلے گا دیپو! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس گھر میں کون تمہاری مدد کرے گا۔ یہی سوچ سوچ کر میں مری جاتی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"آپ کیوں گھبراتی ہیں دادی ماں، میں سب ۔ ۔ ۔ ۔"

"کیسے نہ گھبراؤں۔" دادی اماں جلدی سے اس کی بات کاٹ کر بولیں۔ "چونسٹھ سال ہوئے جب میں اس گھر میں آئی تھی۔ ان چونسٹھ سالوں میں میں نے اس گھر کی عزت کو گھٹتے اور قرضے کو بڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس حویلی کے مکینوں کا بال بال قرض میں بندھا ہے۔ تمہارے دادا کتنے فضول خرچ تھے یہ تم نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ میں نے دیکھا ہے۔ تمہارے باپ کتنے عیاش تھے۔ وہ بھی تم نہ دیکھ سکے۔ لیکن میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے بیٹے کو عیاشی سے اپنے آپ کو برباد کرتے ہوئے عین جوانی کے عالم میں مرتے ہوئے دیکھا ہے اور اب جبکہ سب لٹ چکا ہے۔ رہی سہی پونجی کو تمہارے بڑے بھائی کے ہاتھوں تباہ ہوتے دیکھ رہی ہوں سوائے تمہارے کون ہے جو اس دولت کے عیش و آرام میں ڈوبا ہوا نہیں ہے۔ یہ لوگ نہیں جانتے کہ دولت اور عیش و آرام بے وفا دوست ہیں۔ انہوں نے کب کس

کا ساتھ دیا ہے، ساتھ تو انسان، انسان کا دیتا ہے!"

"مگر دادی ماں آخر اس گھر میں انسان بستے ہیں، دیکھ لینا میں ان ہی لوگوں کی مدد سے اپنے سب کام پورے کر لوں گا۔"

"بھگوان تمہیں سکھی رکھے بیٹا۔ شاید اس گھر کی گرتی ہوئی دیواروں کو سنبھالنے کے لئے ہی تم نے ہمارے خاندان میں جنم لیا ہے۔ بھگوان تمہارے ارادے پورے کریں۔ . . . . لو یہ گلوری کھاتے جاؤ۔" دادی اماں نے کہہ کر، خاصدان میں سے ایک گلوری اٹھا کر خود اپنے پوتے کے منہ میں ڈالی اور اس کے رخساروں کو پیار سے چھوا۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئی تھیں۔ دلیپ نے سر جھکا کر پھر پالاگن کیا اور دھیرے دھیرے کچھ سوچتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ دروازے پر کھڑی نوجوان باندی نے پھر اسے شوخ نگاہوں سے تاکا۔ مگر دلیپ اس کی طرف توجہ کئے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا اور باندی نے دروازے کی اوٹ سے دادی ماں کی نگاہوں سے اوجھل ایسی انگڑائی اس طرح توڑی جیسے اس کے بدن کا سارا نشہ ٹوٹ رہا ہو۔

دلیپ دھیرے، دھیرے سیڑھیاں اتر کر پہلی منزل پر آیا اور اپنے منجھلے بھائی ٹھاکر جوگندر سنگھ کے کمرے میں داخل ہوا۔ جوگندر کا چہرہ لمبوترا تھا اور اس کی داڑھی باریک کٹی ہوئی اور خشخشی تھی اور ٹھوڑی پر ایک تکونی صورت میں نمایاں تھی۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں بڑی لمبی اور بے چین تھیں اور اس کی

گردن بھی لمبی اور دبلی تھی۔ اور اس کے کپڑے میلے اور ڈھیلے ڈھالے ہوتے تھے۔ جوگندر کا خیال تھا کہ وہ ایک عظیم مصوّر ہے۔ جسے دنیا نے ابھی تک نہیں پہچانا۔ اس کے کمرے میں رنگوں کے ڈبے اور برش اور پیالیاں اور ایزل اور کاغذ اور ادھوری نامکمل تصویریں جگہ جگہ عجیب بے ترتیبی اور بے سروسامانی کی حالت میں پڑی تھیں اکثر تصویریں نامکمل تھیں۔ بہت سی تصویریں تو شروع کرتے ہی ایسے ہی چھوڑ دی گئی تھیں۔ کچھ آدھی مکمل تھیں۔ کچھ تین چوتھائی تھیں اور جو بالکل مکمل حالت میں تھیں۔ ان پر برش کا کراس لگا کر مصوّر نے رد کر دیا تھا۔ جوگیندر ایک تصویر کا مصوّر تھا۔ اس نے کہیں سے پڑھ لیا تھا کہ دنیا میں کئی مصوّر ایسے بھی گذرے ہیں جنہوں نے اپنی ساری زندگی صرف ایک تصویر بنانے میں صرف کر دی ہے اور جب تیس چالیس برس کی محنت شاقہ کے بعد وہ تصویر تیار ہوتی، تو اس کا شمار دنیا کے شاہکاروں میں کیا گیا۔ جوگیندر بالکل ایک ایسا ہی شاہکار بنانا چاہتا تھا۔ صرف ایک شاہکار! جس کی تخلیق پر اس کا شمار روبن اور ریمبرانٹ کے ساتھ کیا جائے گا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ گذشتہ پندرہ سال میں اسے اپنی پسند کا موضوع نہیں ملا تھا۔ اس نے سینکڑوں تصویریں شروع کیں مگر اسے جلد ہی معلوم ہو گیا۔ یہ اس کا موضوع نہیں ہے۔ اس نے سینکڑوں کینوس تباہ کئے اور درجنوں ماڈلوں سے عشق کئے۔ مگر کہیں اسے اپنی پسند کا موضوع نہیں ملا۔ اور جب انسان کو اپنی پسند کا موضوع نہ ملے تو وہ شراب پینے لگتا ہے۔ کیف و نشاط کی خاطر نہیں، محض اپنی روح کے دکھ سے مجبور ہو کر۔ سب لوگ ناصح بن کر شراب کی بوتل دیکھتے ہیں، پینے والے کا روحانی کرب کوئی نہیں دیکھتا! کس کا جی چاہتا ہے، کہ دنیا کے سارے کام دھندے چھوڑ کر ہر وقت شراب میں دھت رہے؟ میں کوئی پاگل ہوں، احمق ہوں، بے وقوف ہوں کہ خود نہیں دیکھ سکتا، کہ شراب دھیرے دھیرے مجھے ختم

کر رہی ہے مجھے سوختہ سامان بنا رہی ہے، لیکن میں کیا کروں؟ اگر مجھے اپنی پسند کا موضوع نہ ملے، تو میں اپنی روح کا سوز اور غم کہاں لے کے جاؤں؟ اس گنّے اگانے والے، شکر بنانے والے، جاہل علاقے میں کون ایک مصوّر کے دل کا درد سمجھ سکتا ہے۔ اسی لئے میں پیتا ہوں، اور ہر روز، ہر وقت پیتا ہوں۔ کیونکہ میری روح اس ایک موضوع کے لئے پیاسی ہے، جو غیر فانی ہے اور میرے تخیل سے باہر ہے! جوگیندر نے بوتل منہ سے لگا کر اس کا آخری گھونٹ بھی پی لیا اور پھر بڑی بیزاری سے بولا۔ "لو یہ بھی ختم ہے!"

دلیپ نے اندر آتے ہوئے کہا۔ "کیا ختم ہے جوگیندر بھیّا؟"

جوگیندر نے دلیپ کی طرف دیکھے بغیر ایزل کی طرف مڑ کر کہا۔

"رنگ بھی اور شراب بھی! ــــــ اور اب میرا موڈ بھی ختم ہے!"

یہ کہہ کر جوگیندر نے ایزل سے ایک نامکمل خاکہ اتار کر وہیں برش پر پھینک دیا اور دو قدم چل کر ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ انتہائی بیزار اور ملول!

دلیپ نے مسکرا کر ادھوری تصویر کو فرش سے اٹھا کر اس کا غور سے مطالعہ کیا پھر اس نے نامکمل تصویروں کے ایک ڈھیر پر ڈال کر بولا۔

"سمجھ میں نہیں آتا بھیّا! پندرہ برس سے تم تصویریں بنا رہے ہو مگر آج تک ایک تصویر بھی مکمل نہیں کر سکے۔ جسے دیکھو ادھوری ہے، نامکمل ہے۔"

جوگیندر نے خفا ہو کر کہا۔ "اس میں میرا کیا قصور ہے؟ ہمیں جیب خرچ ہی اتنا کم ملتا ہے۔ کبھی رنگ ختم ہو جاتا ہے۔ کبھی شراب ختم ہو جاتی ہے۔ کبھی دونوں ختم ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک دن ہم بھی ختم ہو جائیں گے۔ . . . . یہ ہے صاحب! ہندوستان کے سب سے بڑے مصوّر کی ٹریجڈی!"

جوگیندر نے خالی بوتل کو دیکھ کر ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

دلیپ بولا۔ ”مگر آرٹ کا شراب سے کیا تعلق ؟“

”تم کیا جانو آرٹ اور شراب کا تعلق ؟“ جوگیندر ایکدم بھڑک کر بولا۔ ”کھینتی باڑی کے کالج سے بی۔ اے کر کے آئے ہو، تو جا کے کسانوں میں بیٹھو۔ ہل چلانے کی بات کرو۔ برش کی نزاکت کو تم کیا سمجھو گے ؟“

”میں تو یہ سمجھتا ہوں بھیا !“ دلیپ طرح دے کر بولا۔ ”اگر تم شراب پینا چھوڑ دو تو شاید تصویریں بنانا سیکھ جاؤ۔“

”پاولے ہوتے ہو۔ اب تم کو کیسے سمجھاؤں ؟ کہ آرٹ اور شراب ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ آرٹسٹ عاشق ہے۔ شراب محبوبہ ہے اور آرٹ دونوں کا رقیب آں !“

”ایں ؟ دونوں کا رقیب ؟ یہ بات ہوئی بھیا ! آج کچھ زیادہ چڑھ گئی ہے ؟“ دلیپ نے پوچھا۔

”کہاں چڑھی ہے دیپو ! اگر چڑھ جاتی تو تم اس طرح سر پر چڑھ چڑھ کر کیوں بولتے ؟“

دلیپ ہنسا۔ ”بہت مشکل ہے بھیا، تم سے بات کرنا۔ تم بات بھی کرتے ہو تو اپنی تصویروں کی طرح نامکمل اور ادھوری بات کرتے ہو !“

”کہیں سے شراب اور لادو ! پھر پوری اور مکمل بات کروں گا !“ جوگیندر نے بے قرار ہو کر کہا۔

”لادوں گا۔ لیکن پہلے میرے کام میں ہاتھ بٹاؤ۔ وعدہ کرو۔“

”وعدہ کرتا ہوں پیارے۔ مگر شراب تو دو !“

”پہلے میری بات سنو۔“ دلیپ نے اپنی جیب سے نقشہ نکالا اور جوگیندر کو اس نقشے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے بولا۔ ”دیکھو یہ ہمارے علاقے کا نقشہ ہے۔“

”ہاں نقشہ تو ہے۔ کیا میں اتنا بھی نہیں سمجھ سکتا ؟“

"یہ رہے کھیت۔ یہ ہماری حویلی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ جنگل۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ دھومی ندی کا راستہ۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مقام سے ندی کو کاٹ کر ایک نہر۔ ۔ ۔ ۔"

"شراب کی نہر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟" جوگیندر نے شرابی لہجہ میں ہنس کر دلیپ سے ہنس کر پوچھا۔ اس کی آنکھیں کرسی پر بیٹھے بیٹھے خود بخود بند ہونے لگیں۔

دلیپ نے چند لمحوں کے لئے جوگیندر کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کوئی جواب دیئے بغیر اس نے نقشے کو تہہ کیا اور اپنی جیب میں ڈالا اور پلٹ کر دروازے کے باہر جانے لگا۔

جوگیندر کا سر کرسی کی ایک ہتھی پر ڈھلک کر رک گیا اور اس کے منہ سے نکلا۔ "اگر شراب کی نہر اسی علاقے میں آجائے تو مزہ آجائے میرے یار!"

دلیپ چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گیا اور ایک لمبا برآمدہ طے کرکے چاچا چمن سنگھ کی خلوت گاہ کی طرف بڑھ گیا۔

چاچا چمن سنگھ میانے قد کے گندمی رنگ کے بڑی ہی معصوم اور بھولی بھالی صورت کے ٹھاکر تھے۔ ان کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ تھی۔ ان کی ڈاڑھی الجھی ہوئی تھی۔ سر کے بال بڑھے ہوئے تھے اور سر کی پگڑی بڑی ڈھیلی ڈھالی تھی ان کی آنکھیں دیکھ کر اکثر اندازہ ہوتا تھا کہ اکثر غائب رہتے ہیں۔ اس لئے جونہی کوئی ان سے مخاطب ہوتا تھا تو ایکدم چونک کر اور گھبرا کر مخاطب ہونے والے کی طرف اس طرح دیکھتے تھے جیسے ان سے کوئی خوفناک قصور سرزد ہوگیا ہے یا وہ

ابھی ابھی غوطہ کھا کر۔ پانی کے اوپر ابھرے ہیں۔ چین سنگھ نے زندگی بھر شادی نہیں کی تھی۔ کیونکہ چاچاجی کو اپنے جانوروں سے عشق تھا اور ہر طرح کے چرند پرند انہوں نے اپنی خلوت گاہ میں رکھے ہوئے تھے۔ جو تین کمروں پر مشتمل تھی اور یہ تینوں کمرے مختلف قسم کی چڑیوں اور پرندوں کے پنجروں سے بھرے ہوئے تھے۔ چاچاچین سنگھ دن رات انہیں پرندوں کی دیکھ بھال میں لگے رہتے۔ انہیں پنجروں کے بیچ میں وہ سوتے تھے۔ اور رات کو بھی کئی بار گھبرا گھبرا کر اپنے پرندوں کی خیریت معلوم کر لیا کرتے تھے۔ یہی پرندے ان کی اولاد تھے۔ یہی ان کا حرم تھا۔ یہی ان کی کل کائنات۔ ان پنجروں کے باہر بھی کوئی دنیا ہے۔ اس کے بھی کوئی مسائیل ہیں۔ اخبار کیا ہے؟ سیاست کیا ہے؟ باندیاں کیسے جوان ہوتی ہیں۔ غلّہ کیسے پیدا ہوتا ہے؟ روپیہ کہاں سے آتا ہے؟ سورج کب غروب ہوتا ہے۔ بادل کب امڈتے ہیں۔ تاروں بھری رات کیسے اپنا جادو جگاتی ہے۔ جوان عورت کے جسم سے کیسی تمنائیں دل میں بیدار ہوتی ہیں۔ بچّے بھوک سے کیسے بلکتے ہیں۔ ماہ وسال کیسے آتے ہیں۔ کیسے جاتے ہیں؟ یہ تمام مسائل چاچاچین سنگھ کے ذہن سے باہر تھے۔ کہیں ہوں گے۔ اگر چاچاچین سنگھ کو ان کا قطعی احساس نہ تھا۔ دلیپ ہرگز ان کی خلوت گاہ کا رخ نہ کرتا۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ سارے خاندان میں چاچاچین سنگھ ہی ایسے فرد ہیں جن کے پاس اپنی کمائی کا ایک حصّہ محفوظ ہے۔ وہ اپنے پرندوں کے مستقبل کے خیال سے اس قدر ہراساں تھے کہ اپنے خرچ کی ایک ایک پائی پر نظر رکھتے تھے دلیپ کا خیال تھا اور خاندان کے دوسرے افراد کا بھی خیال تھا کہ چاچاچین سنگھ نے ضرور اپنے پرندوں کے مستقبل کے لئے ایک معقول رقم ضرور پس انداز کر رکھی ہے۔ اور دلیپ کو معلوم تھا کہ نہر کھودنے کے لئے انسانی ہاتھوں کے علاوہ روپیہ بھی درکار ہوگا۔ اس لئے وہ ذہنی پس وپیش کے باوجود چاچاچین سنگھ

کی خلوت گاہ میں چلا گیا۔

اس وقت جب دلیپ اندر پہنچا تو چاچا چین سنگھ ایک کبوتر کو اپنی ہتھیلی پر رکھے اسے دانہ کھلانے میں مصروف تھے۔ اور بڑی لجاجت اور خوشامد سے اس سے کہہ رہے تھے۔

"کھالے! کھالے! دو دانے ہی کھالے! میرے لوٹن! پچ پچ پچ۔۔۔۔ کل رات سے کچھ کھایا ہی نہیں ہے۔"

دلیپ نے اندر آتے ہوئے صرف آخری فقرہ سنا۔ اس لئے اس نے پوچھا۔

"کیا ہوا چاچا جی! آپ نے کل رات کھانا نہیں کھایا؟"

"کون ہ کون ؟" چاچا چین سنگھ ایکدم گھبرا کر پلٹے۔ اور پھر دلیپ کو دیکھ کر اطمینان سے بولے۔ "تم۔۔۔۔ اچھا اچھا۔۔۔ تم۔۔۔۔ تم۔۔۔۔ ہو" پھر اوسان بجا کرتے ہوئے بولے۔

"نہیں بیٹا میں نہیں" (کبوتر کی طرف اشارہ کر کے) "ان کی بات کر رہا ہوں۔ بڑا شاہانہ مزاج پایا ہے اس ظالم نے۔۔۔۔ کیوں نہ ہو۔ آخر تو لکھنؤ کا لوٹن ہے۔ گھڑی میں تولہ۔ گھڑی میں ماشہ۔"

دلیپ نے جلدی سے بات کاٹ کر کہا۔ "چاچا جی اس وقت میں ایک ضروری کام سے آپ کے پاس آیا تھا۔"

"بتاؤ۔ بتاؤ بیٹا۔ (کبوتر سے) کھالے۔ دو دانے ہی کھالے۔!"

دلیپ نے وہی کاغذ جیب سے نکالا۔ اور اسے ایک خالی پنجرے پر پھیلاتے ہوئے بولا۔

"یہ ہے ہمارا نقشہ!"

"کیا کسی چڑیا گھر کا نقشہ ہے؟" چین سنگھ نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔
"نہیں تو!" دلیپ نے اقرار کیا۔
ٹھاکر چاچا کی دلچسپی ایک دم غائب ہو گئی۔ بجھ کر بولے۔ "تو پھر میرے پاس کیوں آئے ہو (کبوتر کی طرف مڑ کر) ارے میرے لوٹن . . . ایک ہی دانہ اٹھا لے!"

دلیپ نے ذرا غصّہ سے کہا۔
"چاچا جی کیا آپ کا سارا وقت اور ساری دولت اس چڑیا گھر کے لئے صرف ہو گی؟ کیا آپ اپنی زندگی میں کبھی کوئی کام کی بات نہیں کریں گے؟"
"نہیں بیٹا۔ ایسا مت کہو سارے ہیں نے ابھی ان غریبوں کے لئے کیا ہی کیا ہے؟ تم نے سنا نہیں۔ بندیلے کے نواب تیمور جنگ نے اپنے چکور کے لئے جان دیدی تھی۔"
"جان دے دی تھی؟" دلیپ حیران ہو کر بولا۔ "ایک چکور کے لئے؟ وہ کیسے؟"
چاچا چین سنگھ فخریہ لہجہ میں یوں کہنے لگے گویا وہ رامائن یا مہابھارت کا کوئی قصّہ سنا رہے ہوں۔
"نواب تیمور جنگ نے اپنے چڑیا گھر کے لئے ایک چکور بلوچستان سے منگایا تھا۔"
"بلوچستان میں چکور نہیں ہوتا!" دلیپ نے بتایا۔
"تو افغانستان میں ہوتا ہو گا!" چاچا بولے۔ "ہم کیا جانیں۔ ہم کبھی اپنے چڑیا گھر سے باہر نہیں نکلے . . . تو خیر۔ انہوں نے ایک چکور منگایا تھا بڑے ارمانوں اور چاؤ سے اسے پال پوس کے اس قابل کیا کہ وہ اپنے پروں پر اڑ سکے۔"

دلیپ نے داد دی۔ "واہ واہ کیا کام کیا تھا انہوں نے!"

"لیکن بیٹا بھگوان کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہ کمبخت چکور جونہی جوان ہوا۔ نواب تیمور جنگ سے آنکھیں موڑ کے چاند سے عشق کر بیٹھا اور ایک دن پورے چاند کی رات میں نواب سے آنکھیں پھیر کے چاند کی طرف اڑ گیا۔"

"تو کیا ہوا چاچا۔ وہ تو ایک ان پڑھ چکور تھا۔ آج کل تو دنیا کا ہر پڑھا لکھا آدمی چاند کی طرف اڑ جانے کی سوچتا ہے۔"

"ارے بیٹا۔ آدمی کیا کھا کے مقابلہ کرے گا اس چکور کا۔ ارے وہ چکور تو سنا ہے ایسا تھا، جو اسے ایک نظر دیکھ لیتا اسی کا ہو جاتا تھا۔"

"پر نواب تیمور جنگ کا کیا ہوا؟" دلیپ نے قصّے کو ختم کرانے کے خیال سے ذرا تیزی سے پوچھا۔ مگر چاچا چاچین سنگھ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اسی طرح اپنے قصّے میں منہمک بولے۔

"ہوتا کیا بیٹا۔ صبح تک نواب اس بے وفا کا انتظار کرتے رہے۔ لیکن جب چاند ڈوب گیا۔ مرغ بولنے لگے۔ بلبل گانے لگی۔ تیتر چہچہانے لگے۔ کوّے شور مچانے لگے اور جب ـــــ کبھی ـــــ وہ چکور نہ لوٹا تو نواب صاحب نے ایک ہائے کے ساتھ دم دے دیا۔"

"ہائے! کیا شاندار موت پائی نواب صاحب نے" دلیپ نے کھلے طنزیہ لہجہ میں کہا۔ مگر چاچا چاچین سنگھ جس دنیا میں رہتے تھے وہاں تک اس طنز کے پہنچنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے ایک طوطے کے پنجرے کے قریب جا کر بولے

"سچ ہے بیٹا۔ ایسی موت کسی خوش نصیب ہی کو نصیب ہوتی ہے۔" پھر وہ پنجرے میں رکھے ہوئے طوطے کی طرف اشارہ کر کے بولے۔ "ایک وہ نواب تیمور جنگ تھے۔ ایک ہم ہیں کہ پرسوں اچانک ہمارے ہیرامن طوطے کی طبیعت خراب ہو گئی

پہلے ہم نے سمجھا، موسم کا اثر ہے۔ مگر رات کو تو ان کی عجیب حالت تھی۔ تشنج سے ان کا رنگ ہرے سے نیلا ہونے لگتا تھا۔ کس درد سے مٹیں، اینٹھ کر کے گردن ڈھلکائے دیتے تھے۔ ہم پاس کھڑے ان آنکھوں سے ان کا یہ حال دیکھ رہے تھے۔ اور اُف نہ کر سکتے تھے۔ گھبرا کے ویدجی کو بلا بھیجا۔ لیکن اس پتھر دل نے کہلا بھیجا کہ سنتو چمار کا بیٹا بیمار ہے، اسے دیکھنے جا رہا ہوں!"

"سنگدلی کی حد ہو گئی چاچا۔"

"ارے اور کیا ؟ دیکھتے جاؤ۔ کیسا زمانہ آ لگا ہے" اور پہلی بار دلیپ نے چاچا چین سنگھ کے چہرے پر غصے کا تاثر دیکھا۔ "ارے ہمارا ہیرامن تڑپ تڑپ کے پھڑپھڑا لئے اور وہ کمبخت وید چمار کے بیٹے کی بیماری کا رونا رو دئے۔ ارے ان چماروں کے بیٹے تو ہمیشہ مرتے رہتے ہیں۔ ہمارا ہیرامن تو دنیا میں ایک ہے۔ (طوطے سے مخاطب ہو کر) کیوں میرے ہیرے!"

"اچھا تو چاچا اب ہیرامن کا کیا حال ہے ؟"

چاچا چین سنگھ خوش ہو کر دلیپ کی طرف مڑے "ارے بیٹا۔ بھگوان نے تو میری سن لی۔ آج تو یہ سنبھل رہے ہیں۔ آج صبح انہوں نے ایک ہری مرچ بھی کھائی تھی اور ہمیں دیکھ کر اپنی آنکھیں بھی کھولی تھیں۔"

دلیپ نے دل ہی دل میں کہا "چاچا جی۔ ہیرامن نے تو آنکھیں کھول دیں۔ لیکن تم کب اپنی آنکھیں کھولو گے ؟ مگر چاچا کا استغراق دیکھ کر اسے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اور وہ نقشہ اپنی جیب میں رکھے رکھے ہی وہاں سے رخصت ہو گیا۔ دروازے سے نکل کر باہر برآمدے سے مڑ گیا اور نیچے جانے والے زینے کی طرف بڑھا۔ یکایک وہ کچھ سن کر رک گیا۔

جالی کی اوٹ سے اس نے جھانک کر دیکھا تو اسے چاچا چین سنگھ کا بیٹا

مہندر نظر آیا۔ مہندر ایک بے فکرا خوش مزاج نوجوان تھا۔ اور اس وقت دادی اماں کی باندی جوہی کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ جو نیچے رسوئی سے دادی اماں کا ناشتہ دان اٹھائے آرہی تھی۔ اور مہندر کو دیکھ کر تذبذب کی حالت میں سیڑھیوں پر کھڑی تھی۔

"آجاؤ۔ اوپر آجاؤ۔ جوہی!" مہندر شریر لہجہ میں اس سے کہہ رہا تھا۔

"ہم نہیں آئیں گے۔ نہیں آئیں گے" جوہی اٹھلا کر اس سے کہہ رہی تھی!

"کیوں نہیں آؤ گی۔"

"تم ہمیں چھو لوگے!"

"نہیں چھوئیں گے!"

"نہیں۔ . . . . . ہم جانتے ہیں۔ سب جانتے ہیں۔" جوہی شوخ نگاہوں سے تاکتے ہوئے بولی۔ "پہلے تم ہمیں چھو لوگے۔ پھر ہمیں بے بس پاکر اپنی باہوں میں لے لوگے۔ کیونکہ ہم رانی جی کا ناشتہ دان اٹھائے ہوئے ہیں۔ پھر تم ہمیں اپنی باہوں میں لے کر چوم لوگے! اور ہم سے زبردستی پیار کروگے۔"

مہندر نے ہنس کر کہا: "نہیں ہم ایسا کچھ نہیں کریں گے۔ ہم تم سے نہایت شرافت سے بات کریں گے۔"

جوہی نے ایک زینہ چڑھ کے شریر لہجہ میں کہا۔ "واہ تم ہم سے شرافت سے بات کروگے تو پھر ہم تمہارے پاس آئیں گے ہی کیوں ہ؟"

یہ کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور مہندر کے بہت قریب آگئی۔ مہندر جوہی کے رخسار پر چٹکی لے کر بولا۔ "بڑی چلتی ہوئی رقم ہو!"

"تم بھی کچھ کم چلتے ہوئے نہیں ہو مہندر بھیا!" دلیپ بولا۔

مہندر فوراً پلٹا۔ سامنے دلیپ کھڑا تھا۔ جوہی جھپاک سے زینہ کود گئی۔ اور

بھاگ کر نظروں سے غائب ہو گئی۔ دلیپ نے غصے سے پوچھا۔

"یہ کیا کر رہے تھے؟"

"اچھوت ادھار!" مہندر نے جواب دیا۔

"شرم نہیں آتی۔ ایسی باتیں کہتے ہوئے۔" دلیپ نے غصے سے سرخ ہوتے ہوئے کہا۔

"کسی غریب کی عزت لوٹنے کا تمہیں کیا حق ہے؟"

مہندر بولا۔ "کسی غریب کی عزت ہی کہاں ہوتی ہے جو لی جائے۔ تم سن نہیں رہے تھے وہ کیا کہہ رہی تھی؟

"جو وہ کہہ رہی تھی۔ اس میں اس کا دل نہیں۔ بلکہ اس کی مجبوری بول رہی تھی۔" دلیپ نے جواب دیا۔

مہندر نے مسکرا کر کہا۔ "اگر یہ سچ ہے، تو میری یہ دعا ہے کہ بھگوان ان عورتوں کو ہمیشہ غریب اور مجبور رکھے۔ ورنہ ہمارے ایسے لوگ کہاں جائیں گے؟"

دلیپ نے اپنے غصے کو دبایا اور مہندر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی سنجیدگی سے بولا۔ "مہندر کیا تم زندگی بھر کوئی کام نہیں کرو گے؟ کیا ہمیشہ اسی طرح لونڈیوں اور باندیوں کے پیچھے گھومتے رہو گے؟"

"یہ کوئی کم کام نہیں ہے بھیا! اور بہت مشکل کام ہے بھیا! تم نے کبھی ادھر توجہ نہیں دی ہے۔ اس لئے تم کیا جانو، کتنا مشکل کام ہے یہ!"

دلیپ نے کہا۔ "میں تمہیں ایک کام بتاتا ہوں، میرے ساتھ مل کر کرو۔ تم نوجوان اور عقلمند ہو۔ ساری زندگی لونڈیوں کے پیچھے کیسے تباہ کر سکتے ہو۔ میں تمہیں ایک کام کی بات بتاتا ہوں۔ دیکھو، یہ ہے ہمارے علاقے کا نقشہ۔ اور یہ رہی دھومی ندی . . . . اور یہ ہمارے کھیت . . . . . اب اگر ہم اس ندی سے نہر کاٹ کر

پانی . . . . ۔" مہندر نے بات کاٹ کر کہا۔

"جب سے تم اگری کلچرل کالج سے ڈگری لے کر آئے ہو۔ تمہارے دماغ میں ندی کا پانی گھس گیا ہے۔ ارے بھیا! یہ کیا کھڑاگ لے بیٹھے ہو تم؟ کسی اور پانی کی بات کرو۔ شراب کے پانی کی بات کرو۔ یا پھر چاہِ ذقن کا پانی اب ایسے پانیوں کی بات کرو تو میں تمہارے ساتھ کام کرنے کو تیار ہوں!"

دلیپ نے مہندر کا کاندھا جھنجوڑ دیا اور مزید کچھ کہے بغیر زینے سے اتر گیا۔ مہندر پلٹ کر اوپر چلا گیا جدھر جو ہی گئی تھی۔

زینہ اتر کے کئی برآمدے اور دالان طے کر کے دلیپ شاعر چاچا کی وسیع بیٹھک میں داخل ہوا۔ بیٹھک میں قالین بچھے تھے۔ ایک طرف چاندنی پر گاؤ تکیہ لگا تھا اور اس گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے ہوئے کڑھی ہوئی عنابی رنگ کی دو پلی پہنے ہوئے، اطلسی اچکن زیب تن کئے ہوئے ٹھاکر لوکیندر سنگھ اپنے احباب کے گھیرے میں اپنا کلام سنا رہے تھے۔ صبوحی چل رہی تھی اور جام پر جام خالی ہو رہے تھے۔ اور ٹھاکر لوکیندر سنگھ جن کا تخلص مسکینؔ تھا اپنے احباب سے یوں مخاطب تھے۔

"اب میرے حضور شعر سنیئے۔ آپ کی توجہ کا محتاج ہوں۔"

"ارشاد . . . . ارشاد . . . ." بہت سے مصاحب ایکدم بول اٹھے

لوکیندر سنگھ مسکینؔ نے پہلو بدلا۔ دو پلی ٹھیک کی۔ پھر بولے۔ "عرض کرتا ہے خاکسار۔ ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیے۔"

میاں مجنوں سے کل لیلیٰ کے پیچھے ہو گئی کشتی

"لفظِ کشتی کی داد چاہتا ہوں اہل ذوق سے!"

"واہ واہ۔ مسکین صاحب۔ مجنوں سے کشتی لڑنا آپ ہی کا کام ہے۔ واہ

واہ۔" اتنا کہہ کر ایک مصاحب نے جام کر دیا۔
"آداب عرض ہے! پھر توجہ دیجئے حضور۔"
میاں مجنوں سے کل لیلیٰ کے پیچھے ہو گئی کشتی
کبھی میں اس کے نیچے تھا کبھی وہ میرے اوپر تھا
"اے واہ۔ سبحان اللہ۔" ایک مصاحب بے اختیار بول اٹھا۔ "کیا بات
پیدا کی ہے۔ کبھی میں اس کے نیچے تھا کبھی وہ میرے اوپر تھا۔"
دوسرا: "یعنی کسی حالت میں زمین نہیں چھوڑی آپ نے!"
تیسرا: "یہی تو اس شعر میں نکتہ ہے۔"
مسکین۔ "آپ کے شعر سمجھنے کی داد دیتا ہوں اور دوسرا شعر عرض کرتا ہوں۔
میری قسمت بھی آٹا پیسنے کی بن گئی چکی
چوتھا مصاحب: "جواب نہیں۔ کیا قسمت کو چکی سے مثال دی ہے، مسکین
صاحب!"
مسکین:۔ "آداب عرض کرتا ہوں۔"
میری قسمت بھی آٹا پیسنے کی بن گئی چکی
جو دانہ اس میں ڈالا ہو وہ آٹا بن کے باہر تھا!"
پانچواں: "واہ! واہ! کیا دانہ ڈالا ہے۔"
چھٹا: "جبھی تو ہر شعر پیسا ہوا چلا آرہا ہے۔"
دوسرا: مسکین صاحب آپ کا ہر شعر ادب کی خدمت کر رہا ہے!"
تیسرے مصاحب نے دوسرے مصاحب سے سرگوشی میں کہا۔ "ارے
یار ادب کی خدمت کے ساتھ ساتھ اپنی بھی خدمت کرتے چلو۔ دیکھتے نہیں ہو
اپنے گلاس کب سے خالی پڑے ہیں؟" اس پر دوسرا مصاحب چونکا۔ جلدی جلدی

اس نے اپنا اور اپنے ساتھیوں کے خالی گلاس صراحی اٹھا کر بھر لئے۔ اتنے میں مسکین صاحب نے بھی ایک گھونٹ پی کر کہا۔ "حوصلہ افزائی کے لئے ناچیز آپ کا شکریہ ادا کرتا ہے اور مقطع عرض کرتا ہے۔" اتنے میں شاعر چاچا کی نظر دلیپ پر پڑ گئی۔ بے حد مسرور ہو کر بولے۔ "ارے آؤ۔ آؤ۔ دلیپ بیٹا۔ اندر چلے آؤ۔ بہت دیر میں آئے مگر۔ آج رات کو میں نے ایک چھپن شعر کی ایک غزل کہی تھی۔"

اس پر فوراً ایک مصاحب بول اٹھا۔ "غزل کیا ہے دلیپ بھیا۔ چھپّن چھری ہے چھپن چھری! ہر شعر کلیجے میں اتر جاتا ہے۔ (ایک مصاحب) ذرا وہ کباب کی پلیٹ آگے بڑھا دینا۔" دوسرا مصاحب پلیٹ آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "جس طرح تم کباب کھا رہے ہو اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر کباب کلیجے میں اترنے کے بعد تمہارے معدے میں اتر رہا ہے۔"

اس پر ایک زور دار قہقہہ بلند ہوا۔ جسے فوراً پہلے مصاحب نے یوں بند کیا۔ "ارے چپ بھی رہو۔ ۔ ۔ ۔ ہاں ٹھاکر صاحب وہ مقطع عنایت ہو جائے۔ اب انتظار کی تاب نہیں ہے! لوکندر سنگھ مسکین نے مسکرا کر پہلو بدلا۔ دوپلّی ٹھیک کی اچکن کا شکن دور کیا اور آداب بجا لاتے ہوئے بولے۔

ذرہ نوازی ہے آپ کی۔ عرض کیا ہے!

نہ پوچھو آواگون اور آدمی کی بات مسکین سے

یکایک چوتھا مصاحب تیسرے مصاحب کو ٹوکتے ہوئے بولا۔ "یار کیسے بدذوق آدمی ہو۔ پان بعد میں کھانا پہلے مصرعہ تو دہراؤ۔"

تیسرا مصاحب فوراً کلے میں پان داب کر بولا۔ "نہ پوچھو آواگون اور آدمی کی بات مسکین سے"

چاچا شاعر نے دلیپ کو خاص طور پر اپنی توجہ کا نشانہ بنا کر کہا۔

"سر سے پاؤں تک کان بن کے سنو دلیپ۔ جب بدھی میں یہ شعر بیٹھے گا۔"
اس پر دلیپ فوراً چوکنا ہو گیا۔ مسکین صاحب اسے اپنی طرف متوجہ پا کر بولے۔

نہ پوچھ آواگون اور آدمی کی بات مسکیں سے
کہ پہلے جنم میں ڈاروِن بھی ایک بندر تھا!

چوتھے مصاحب نے اس پر ہنکار کر کہا۔ "آہاہا۔ آہاہا۔ کیا ایجوکیشنل شعر ہوا ہے!"

پانچویں مصاحب نے فوراً اسے ٹوک کر کہا: "ایجوکیشنل؟ اجی صاحب یہ شعر مجھے تصوف سے لبریز نظر آتا ہے۔ آواگون اور آدمی۔ ڈاروِن اور بندر۔ زندگی کا سارا فلسفہ اس میں ٹھاکر صاحب نے بند کر دیا ہے اس اکیلے شعر میں۔ . . . .
ذرا مرغی کی ایک ٹانگ دینا!" اس پر دوسرے مصاحب نے اپنا گلاس چڑھاتے ہوئے کہا۔ "بس ختم کر دیا ہے یہ مضمون! اب اس سے آگے کچھ ہو نہیں سکتا!"
اس پر پہلا مصاحب بولا۔
"مگر یہ بھی تو دیکھئے۔ کتنی سخت زمین میں کتنا کھلتا ہوا شعر کہا ہے! واللہ۔"
دلیپ نے آگے جھک کر اپنے شاعر چاچا سے کہا۔ "چاچا جی۔ شعر کی زمین کے ساتھ ساتھ اپنی زمین کی بھی فکر کرتے جائیے نا۔ پانی کے بغیر کھیتوں سے ایک دانہ کبھی نہیں اگے گا! میں اس وقت آپ کے پاس یہ نقشہ لے کر آیا ہوں۔"
اتنا کہہ کر دلیپ نے جیب سے نقشہ نکالا۔ اور چاچا جی کو سمجھانے لگا۔ ٹھاکر لوکندر سنگھ پہلے تو خاموشی سے اس کی بات سنتے رہے۔ آخر میں بیزار ہو کر بولے۔
"لاحول ولا۔ دلیپ، تم بھی کیا آدمی ہو۔ کہاں شعر کی زمین کہاں کھیتی باڑی کی زمین کیسے بد ذوق ہو۔ شعر و شاعری میں ہل چلانے بیٹھ گئے۔ کالج سے یہی پڑھ کے آئے ہو۔ سارا موڈ خراب کر دیا تم نے۔ ستیاناس کر دیا۔ یہ بھی نہیں دیکھتے کیسے کیسے

شعر نواز احباب کی محفل جمی ہے۔ صبح صبح صبوحی کا مزہ کر کرا کر دیا تم نے۔" یہ کہہ کر مسکین صاحب نے بیزار ہو کر دلیپ سے منہ پھیر لیا اور دلیپ دل ہی دل میں شرمندہ ہو کر وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ایک مصاحب ذرا جسارت کر کے بولا۔ "اجی قبلہ مسکین صاحب، آپ اپنا دل کیوں میلا کرتے ہیں۔ جانے دیجیئے۔ آج کل کے لونڈے شعر و شاعری کا لطف کیا جانیں!"

دوسرا: "مزہ کر کرا کر دیا!"

تیسرا: "ہری بھری محفل اجاڑ دی!"

چوتھا: "میرے خیال میں اب چلنا چاہیئے۔ موڈ ختم ہے (پانچویں سے آہستہ سے) اور شراب بھی ختم ہے۔ صراحی خالی ہے۔ (بلند آواز سے) میرے خیال میں اب ٹھاکر صاحب سے اجازت لے لیں!" یہ کہہ کر وہ حضرت اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے ساتھ دو تین اور افراد بھی۔ اس پر شاعر چاچا جو اب تک منہ پھیرے بیزار بیٹھے تھے۔ فوراً چونک کر سنبھل گئے۔ اور جلدی سے بولے "ہائیں ہائیں حضت! اتنی جلدی کہاں چلے؟ ابھی تو میں نے آپ کو کل رات والی غزل ہی سنائی ہے۔ چھتیں شعر والی۔ مگر آج صبح چوہتر بیت کی دوسری غزل ہو گئی ہے۔ وہ تو آپ کو ابھی سنائی نہیں۔ (چلا کر) اے منیا، صراحی بھر لو۔ سب کو جام دو۔ تشریف رکھیئے۔" جام بھرتے دیکھ کر سب لوگ بیٹھ گئے۔ مسکین صاحب نے جیب ٹٹول ٹٹول کر ایک نیا پلندہ نکالا۔ یہ ایک لمبا سا کاغذ تھا۔ جس پر ٹھاکر لوکندر سنگھ نے چوہتر بیت کی غزل لکھی تھی۔ اس کاغذ کا ایک سرا شاعر چاچا کے ہاتھوں میں تھا دوسرا نیچے لٹک کر چاندنی کو چھو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ایک مصاحب نے دوسرے مصاحب سے کہا۔

"یہ غزل ہے کہ جنم پتری!"

دوسرے مصاحب نے فوراً اپنی مسکراہٹ کو دبا لیا۔ کیونکہ اب لوکندر سنگھ حاضرین کی طرف متوجہ تھے۔ اور کھنکار کر کہہ رہے تھے۔

"مطلع عرض کرتا ہوں حضور!"

رگ گل سے بلبل کے پَر باندھتے ہیں
نہیں باندھا جاتا، مگر باندھتے ہیں۔

"آہا ہا۔ نہیں باندھا جاتا مگر باندھتے ہیں۔ نہیں باندھا جاتا۔ ۔ ۔ مگر۔ ۔ ۔ واہ واہ۔ سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔ قیامت ڈھا دی اس شعر نے۔ آہا ہا۔ قلم توڑ دیا۔ واللہ۔"

مصاحب سر پیٹ پیٹ کر داد دینے لگے۔ چاروں طرف سے تحسین ناشناس کا ڈونگرا برسنے لگا۔ اور لوکندر سنگھ مسکین جھک جھک کر آداب عرض کرتے ہوئے داد وصول کرنے لگے۔

دلیپ دو تین وسیع و عریض برآمدوں سے گذرتا ہوا جرنیل چاچا کے گھر کی طرف چلا۔ اس کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ مگر پھر بھی اس نے جی کڑا کر کے جرنیل چاچا کے گھر جا کے ان سے بات کرنے کی ٹھان لی۔ جرنیل چاچا کسی زمانے میں ریاست جارن گڑھ کی فوج کے جو صرف چالیس نفری پر مشتمل تھی۔ کمانڈر ان چیف رہ چکے تھے۔ اور گھر بھر میں جرنیل چاچا کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ وہ اس وقت اپنے گھر کے باہر کے برآمدے میں گاؤں کے پٹواری میاں

صدرالدین سے مرغے لڑا رہے تھے اور اپنے مرغے کو بڑھاوا دیتے ہوئے صدرالدین سے کہہ رہے تھے

"دیکھو میاں، کیسا چوکھا پینترا اچھل رہا ہے۔ طاؤسی قوم کا مرغ ہے میرا— معمولی نسل کا نہیں ہے۔"

میاں صدرالدین نے اپنے مرغ کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا۔ "میرا بھی عنابیا نسل کا مرغ ہے، جرنیل صاحب۔ ابھی دبوچ لے گا تمہارے ٹینی کو۔"

"مر گئے دبوچنے والے۔" جرنیل چاچا گرج کر بولے۔ "میرا کلنگ ابھی رگید ڈالے گا، تمہارے بدگوشتے کو!"

اتنے میں جرنیل چاچا کے مرغے نے اچک کر میاں صدرالدین کے مرغے پر حملہ کیا۔ تو جرنیل چاچا خوشی سے پکار اٹھے۔

"دیکھا کیا انی ماری ہے میرے پاکھٹے نے۔ ایسا چابک پیرا ہے کہ تمہارا مرغ ابھی پالا چھوڑ کر بھاگے گا۔"

ابھی جرنیل چاچا نے اتنا ہی کہا تھا کہ میاں صدرالدین کے مرغے نے بڑھ کے جرنیل چاچا کے مرغ پر حملہ کیا۔ تو میاں صدرالدین خوشی سے چلّا اٹھے۔

دیکھ لو ٹھاکر۔ کیا پونما مارا ہے میرے شیر نے تمہارے گیدڑ کو!"

"ابھی دیکھنا میرا طاؤسی ایسی کھلی پائی مارے گا کہ چیں بول جائے گی تمہارے بدذاتے کی!"

اتنے میں جرنیل کی نظر دلیپ پر پڑ گئی۔ تو وہ اسے بلاتے ہوئے بولے۔ "آؤ آؤ، دلیپ۔ دیکھو۔ آج صبح ہی کیا گھمسان کا رن پڑا ہے۔ تمہارے کالج میں مرغوں کی لڑائی تو سکھاتے ہوں گے۔ ہیں؟"

"نہیں تایا جی۔" دلیپ نے بڑی عاجزی سے کہا۔

"نہیں سکھاتے ؟" جرنیل صاحب نے حیران ہو کر پوچھا۔ "تو پھر کیا سکھاتے ہیں۔ میاں جانتے ہو۔ پرانے زمانے میں جتنے بڑے بڑے جرنیل ہوتے تھے۔ سب مرغوں کی لڑائی لڑتے تھے اور اس لڑائی سے جو بھی سبق سیکھتے تھے اسے میدان جنگ میں استعمال کرتے تھے (مرغے) واہ میرے شیر! آگے بڑھ جا میرے نپولین! میرے ہلاکو! چنگیز خاں!" تایا جی کا طاؤسی مرغ بڑھ بڑھ کے صدرالدین کے مرغ پر وار کرنے لگا اور جب صدرالدین کا مرغ مات پر مات کھا کر زخمی ہونے لگا تو صدرالدین نے اسے پالے سے اٹھا لیا۔ اور تایا جی تالی بجا بجا کر اپنی جیت کا اعلان کرنے لگے۔ انہوں نے اپنے طاؤسی کو گود میں اٹھا لیا اور اس کی چونچ پر پیار کر لیا۔ اور فخریہ لہجہ میں دلیپ کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

"دیکھا میرے مرغ کو! جانتے ہو۔ یہ کون ہے؟ یہ تیس ڈنکا ہے۔ تیس ڈنکا۔ ہاں اس کے جیتنے کا تیس دفعہ ڈنکا بج چکا ہے۔"

دلیپ جل کر بولا۔ "اگر اس کا ڈنکا اسی طرح پٹتا رہا تو ایک دن اس گھر کا ڈنکا بج جائے گا۔"

"کیا مطلب ؟" چاچا جرنیل سنگھ حیران ہو کر بولے

"مطلب یہ کہ مرغا لڑاتے لڑاتے یہ دنیا ایکدن ہم کو بھی مرغا بنا دے گی۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو ؟" جرنیل بہادر اس کا مطلب نہ سمجھ کر بولے۔

دلیپ نے ذرا تلخ لہجہ میں بولا۔ "میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہماری بہت سی زمین پانی کے بغیر سوکھی پڑی ہے اور جب تک ہم دھومی ندی سے ایک چھوٹی سی نہر نکال کے اپنے کھیتوں میں نہیں لائیں گے، یہ زمین سوکھی رہے گی۔ اس کے لئے میں نے یہ سوچا تھا کہ اگر ہمارے خاندان کے سب لوگ مل کر کام کریں اور آپ مجھے دو سو روپے . . . . . "

جرنیل چاچا فوراً بھڑک کر بولے۔" دو سو روپے۔ دو سو روپے کیا بات کرتے ہو دلیپ ؟ دو سو نقد اگر اس وقت ہوتے تو میں دو مرغ نہ خرید لیتا میاں صدر الدین سے ؟ ارے ان کے پاس دو ایسے کھڑ دنے مرغ موجود ہیں، کہ بڑے سے بڑے کڑک ناتھ کو دو منٹ میں اونٹا کر دیں ۔۔۔ دو سو روپے ہوتے تو ابھی وہ دونوں مرغ ان سے خرید لیتا ۔"

" ضرور خرید لیجئے ۔" دلیپ نے مزید تلخی سے کہا۔

جرنیل چاچا غور کرتے ہوئے بولے۔" ویسے مجھے کھیتی باڑی کا بہت شوق ہے ۔ میں تم کو بتاتا ہوں۔ میں ہمیشہ سوچتا رہتا ہوں کہ اگر ہمارے کھیتوں میں اناج نہیں ہوگا تو ہمارے مرغ کھائیں گے کیا ؟"

"آپ کی سوچ بچار کا طریقہ بہت عمدہ ہے !"

" ہاں اسی لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ اس معاملے میں مجھے تم سے پوری پوری ہمدردی ہے ۔ یہ اقبال ہے ۔ تم یہاں سے سیدھے بڑھے بٹھا کرجی کے پاس جاؤ اور ان سے اس معاملے میں بات کرو۔ میں ذرا اپنے لغبغے کو نہلا لوں ۔"

چاچا جرنیل اپنے مرغ کو سہلاتے ہوئے اندر کو مڑ گئے ۔ جہاں صدر الدین بھی آداب کے لئے اپنا مرغ سنبھال کر باہر نکل گیا۔ ان کے جاتے ہی دلیپ اکیلا رہ گیا۔ اس نے اداس ہو کر اپنا سر جھکا لیا اور آہستہ آہستہ برآمدے سے باہر نکل گیا اور صحن میں آگیا

حویلی کے وسیع صحن میں اس کے مرحوم چچا ادھیراج سنگھ کا اکلوتا بیٹا پرتھوی راج پتنگ اڑا رہا تھا۔ چچا ادھیراج سنگھ کی دہلی میں بہت بڑی جائداد تھی وہ انہوں نے رنڈی بازی میں پھونک دی، رہی سہی جائداد ان کے مرنے کے بعد ان کے اکلوتے بیٹے پرتھوی راج نے ٹھکانے لگا دی ۔ اور اب وہ پالن

گڑھ میں اپنے تایا کے گھر آ کر رہنے لگا تھا۔ پرتھوی راج بہت ہی بدزبان کھرا اور لڑاکا مشہور تھا۔ اور دن بھر پتنگ اڑانے کے سوا اسے اور کوئی کام نہ تھا۔ دن بھر اپنی عمر سے بہت کم کے گاؤں کے لونڈے جمع کر لیتا اور پتنگ اڑایا کرتا۔ دلیپ اس سے بہت بد گماں تھا اور اس وقت بھی کنی کاٹے کر بڑے کھاکر تایا کی مردانہ بیٹھک کی طرف جانا چاہتا تھا۔ مگر عین صحن کے بیچ میں اس وقت پرتھوی راج پتنگ کے پیچ بڑھا رہا تھا اور پندرہ بیس لونڈے اس کے گرد شور غل بپا کئے ہوئے تھے۔ اور پرتھوی راج ایک لونڈے سے ڈپٹ کے کہہ رہا تھا۔

"ابے لمڈے! چرخی ٹھیک سے پکڑ۔ ڈھیل دیئے دے۔ نہیں تو پتنگ کنوں سے چلی جائے گی!"

"ٹھیک سے تو پکڑ رکھی ہے چاچا۔" مسکین صاحب کا بڑا لڑکا ان سے کہہ رہا تھا۔ "پیچ تو چھوٹ گئے۔" "میں نے خود چھڑائے ہیں باشا!" پرتھوی راج سن کر غرور سے بولا۔ "اب اوپر سے غوطہ دے کر ردا مارے دے رہا ہوں۔"

ایک لڑکے نے صلاح دی۔ "میری مانوں تو نیچے سے اٹھا کر کھینچائی ڈالو۔"

پرتھوی راج چلا کر بولا۔ "ابے تیرے باپ نے کبھی کبھی پتنگ اڑائی تھی؟ یہ اناڑیوں کا قاعدہ ہے۔ ہم نے دلی میں رہ کر فن والوں سے دس سال تک پتنگ بازی سیکھی ہے۔ پتنگ کا پیٹا نہیں دیکھ رہا ہے اور ہوا کتنی تیز ہے؟ ایسے میں کہیں کھینچائی ہوتی ہے گدھے!؟"

یکایک جرنیل چاچا کا لڑکا بول اٹھا۔ "چاچا اس طرف والے کی پتنگ کنّی کھا رہی ہے۔"

"دیکھ پیارے!" یکایک پرتھوی راج نرم لہجہ میں بولا۔ "ابھی ردا مار کے کنوں سے اڑائے دے رہا ہوں۔ وہ بھی کیا یاد کرے گا میرا یار!"

پرتھوی راج نے مخالف کی پتنگ میں پیچ ڈال دیا تھا۔ مگر بدقسمتی سے ہوا یہ کہ بے دھیانی میں چلنے سے پتنگ کی ڈور دلیپ کے پاؤں میں الجھ گئی۔ اور پرتھوی راج کی پتنگ ایک ہی جھٹکے میں کٹ گئی۔ پرتھوی راج نے جو دلیپ کی آمد سے بے خبر تھا پلٹ کر چرخی پکڑنے والے لڑکے سے ڈانٹ کر کہا۔

"ابے ڈھولکی کے کٹوا دی نہ میری پتنگ!"

اور کہہ کر اسے زور کا ایک چانٹا رسید کیا۔ لڑکا چانٹا کھا کر زور زور سے رونے لگا اور فریاد کرنے لگا۔ "پتنگ مجھ سے نہیں، دیپو بھیا کے پیروں میں الجھ کر ٹوٹی ہے۔" اس پر پرتھوی راج نے رخ بدل کر دلیپ کی طرف دیکھا۔ اور اسے پہچان کر بڑے تلخ لہجہ میں بولا۔

"میاں پتنگ باز کے پاس کھڑے ہو کر پتنگ بازی دیکھنا بھی ایک ہنر ہے! ہتوں سے چلی گئی میری پتنگ! دوسروں کے سامنے ہیٹی ہو گئی کہ نہیں۔ اک تمہاری ذرا سی غلطی سے! ذرا دیکھ کر چلا کرو۔ اب ایسے اندھے بھی نہیں ہو!"

دلیپ نے سر ہلا کر افسوسناک لہجہ میں کہا۔ "میرے خیال میں اس گھر میں سبھی اندھے ہیں۔" یہ کہہ کر دلیپ تیزی سے آگے بڑھ گیا اور بڑے ٹھاکر یا تایا صاحب کے گھر کی طرف چلا گیا۔

پرتھوی راج نے دلیپ سے پوچھا۔ "کیا کہا؟" پھر جب دلیپ نے کوئی جواب نہیں دیا اور آگے بڑھ گیا تو اپنے آپ سے بولا۔ "جانے کیا کہا؟" پھر وہ مڑ کے چرخی پکڑنے والے لڑکے سے مخاطب ہوا۔ اور اپنا سارا غصہ اس پر نکالتے ہوئے بولا۔ "ارے اس کی چھوٹی سی چیاں سی دمڑ چیل میرے دو پلکے پتنگ کو کاٹ گئی۔ تیری ایک ذرا سی غلطی سے!"

لڑکے نے خوفزدہ ہو کر اپنا پہلو بچاتے ہوئے کہا۔ "مگر وہ تو دیپو چاچا

نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اس کی بات کاٹتے ہوئے پرتھوی راج فوراً کڑک کر بولا، "تو ڈور کیوں نہیں سنبھالتا ٹھیک سے ؟"

"پیچ کا پکڑ ٹھیک ہے! اور تو ۔۔۔۔ ابے تجھے کہہ رہا ہوں۔" پرتھوی راج نے جرنیل چاچا کے لڑکے سے کہا۔ "وہ لال دُمّی پتنگ اِدھر لا۔ اب کے میں دھرّا باندھ کے اچنّم کی وہ ٹھمکی دوں گا کہ اوپر کا جھول تلوار کی کاٹ کرے گا۔"

دلیپ کھلکھلاتا ہوا کے زنان خانے میں داخل ہو گیا۔

زنان خانے کے مشرقی برآمدے میں پہونچ کر دلیپ نے دیکھا کہ جگہ جگہ تخت لگے ہیں۔ اور گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے حویلی کی ٹھکرائینیں گدّے دار تختوں پر اینڈ رہی ہیں۔ باندیاں اور مامائیں ایک تخت سے دوسرے تخت اور برامدے سے آنگن اور آنگن سے برآمدے کو بھاگتی ہوئی اپنی اپنی مالکن کا حکم پورا کرنے میں لگی ہوئی ہیں۔ چاروں طرف دھما چوکڑی مچی ہوئی ہے اور کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ایکدم طرح طرح کے احکام کی آوازیں دلیپ کے کانوں میں آنے لگیں۔

"اری مُردی۔"

مردار

بدقومی

جنم جلی

کہاں مرگئی جا کر منیا۔ چائے نہیں لاؤ گی؟"

"اری سنتو یہ کتھا کتنا پھیکا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اسے ٹھیک طرح سے جوش نہیں دیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے پان نہیں کھا رہے ہیں گھاس کھا رہے ہیں۔"

چاچا جین سنگھ کی بیوی پدمنی جو بے حد موٹی اور بدصورت تھیں، پرتھوی راج کی بیوی کامنی پر رعب جماتے ہوئے کہنے لگیں۔

"پان تو ہمارے مائیکے میں ہوتے ہیں، اصلی جونپوری۔ ہرا پتہ اور ریشمی کنارا اور منہ میں ڈالو تو ایسا مزہ جیسے ہری ہری مرچ کا۔

جوہی جو پاندان کے سامنے کھڑی تھی۔ اکدم بول اٹھی۔ "تو رانی جی آپ پان کے بجائے ہری مرچیں ہی کھایا کیجئے نا!"

"چل بدزبان!" پدمنی اسے پیار سے ڈانٹ بتاتی ہوئی بولیں، "پاندان یہاں رکھ دے اور بھاگ یہاں سے اور رسوئی میں جا کے مہراج سے کہدے آج ہم ناشتے میں کھیر پاٹے پراٹھے کھائیں گے۔"

"جی بہت اچھا،" کہہ کر جوہی جو رخصت ہونے لگی تو اکدم اس پر فرمائشوں کی بھرمار ہونے لگی۔ بڑی ٹھکرائین بولیں۔ "کچن میں جا رہی ہے تو مہراج سے کہہ دینا ہماری طرف سے کہ ہمارے لئے ناشتے میں گاجر کا حلوہ رکھدے"

جرنیل چاچا کی بیوی لکشمی کے منہ میں پانی بھر آیا بولیں۔ "کہدینا کہ اس پر بادام کے مغز چھڑک کر لیتے کی ہوائیاں بکھیر کر اس میں سات مغزی ڈال کر اوپر سے گلاب چھڑک دے۔"

کامنی بولی۔ "اور میرے لئے آلو بھرے پراٹھے۔ اور نیبو کا اچار اور جل جیرا"

مہندر کی بیوی کملا بولی، "اور میرے لئے پکوان کی پوریاں اور شیرمال اور راج شاہی کھیر اور بادام سے گھولی ہوئی فیرنی اور شاہی ٹکڑے۔" اور جوہی گھبرا کر بولی۔ "رانی جی آپ ناشتہ کریں گی یا کھانا کھائیں گی۔"

اس پر کملا جو دوسری ٹھکرائینوں کے ساتھ تاش کھیل رہی تھی۔ ڈانٹ کر کہا "چل ہٹ کیا لنتر باتیں کرتی ہے۔ چل بہنا اپنا پتہ۔ میں نے تو چل دیا۔

اب تیری باری ہے۔"

پدمنی پتہ چلتے چلتے رک گئی۔ اسے کچھ یاد آیا، تو اس نے جوہی کی طرف دیکھا مگر جوہی وہاں سے جا چکی تھی۔ تو اس نے بڑی ٹھکرائین کے پاؤں دباتی ہوئی دھنیا سے کہا "اے دھنیا ذرا ایک کے مہاراج سے کہہ دیا کہ شاہی ٹکڑوں کے ساتھ بالائی ضرور بھیجے اور بالائی کے ساتھ اگر شہد بھی ہو۔ اور شہد کے ساتھ اگر سیب کا مربہ اور مربے کے ساتھ سونے چاندی کے ورق اور...... "

دلیپ بولا۔" اور مہاراج سے یہ سب کچھ کہہ کر ویدجی کو جلدی سے بلا لانا۔"

"ویدجی کو کس لئے بلوا رہے ہو؟" کامنی بولی۔

"آپ لوگوں کے لئے!" دلیپ مسکرا کر بولا۔

"کیوں ہمیں کیا ہوا ہے؟" بہت سی ٹھکرائنیں ایک ساتھ پوچھنے لگیں۔

"آپ ناشتے میں اتنا کچھ کھائیں گی، تو ویدجی کو تو بلوانا ہی پڑے گا!" دلیپ نے ہنس کر کہا۔ اور پھر سب کو باری باری تعظیم دینے لگا۔ "پالاگن تائی جی ــــ پالاگن چاچا جی۔ پالاگن بہوجی۔ پالاگن... "

سب ٹھکرائنیں ہاتھ بڑھا بڑھا کر اسے آسیس دینے لگیں اور بڑی ٹھکرائن نے پوچھا۔ "آج صبح صبح کہاں کی تیاری ہے ہے؟"

دلیپ نے جواب دیا۔" اب صبح کہاں ہے تائی جی۔ اس وقت تو ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں۔" اس پر پدمنی حیران ہو کر بولی "ساڑھے گیارہ!؟ اس دالان میں تو دھوپ آئی نہیں!" دلیپ نے کہا "دھوپ کیسے آئے گی۔ آسمان پر بادل ہیں۔ چاچی جی کبھی اپنے تخت سے اٹھ کر باہر کی دنیا پر بھی ایک نظر ڈال لیا کرو۔"

بڑی ٹھکرائن بیزار ہو کر بولیں۔ "تم پتہ چلو بہنا! دلیپ کا لیکچر تو کبھی بند

نہ ہو گا۔"

دلیپ مسکرا کر برآمدے کے دوسرے سرے کی طرف چلتا گیا اور برآمدہ طے کر کے ایک نیم تاریک غلام گردش میں داخل ہو کر چلتے چلتے ٹھاکر جی کے دیوان خانے میں پہنچ گیا۔ دیوان خانے کے چاروں طرف دیواروں پر خاندان کے بزرگوں اور پرکھوں کی تصاویر چاندی کے فریم میں جڑی ہوئی لگی تھیں۔ چھت کے وسط میں ایک پرانا استنبولی جھاڑ لٹک رہا تھا۔ ایک اونچے تخت پر بیٹھے ہوئے بڑے ٹھاکر، کرپا شاہ مہاجن سے شطرنج کھیل رہے تھے۔ دلیپ نے دبی زبان میں پالا گن گیا۔ تو ٹھاکر جی نے دیکھے بغیر "ہوں" کہا۔ اور بدستور اپنی بازی میں مستغرق نظر آئے۔ دلیپ نے دوسری بار پھر ذرا اونچی آواز میں "پالاگن تایا جی" کہا۔ تو بڑے ٹھاکر بساط سے نظر اٹھا کر دلیپ کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے۔ "جیتے رہو بیٹا۔ کہاں جا رہے ہو۔ اتنے سویرے سویرے؟"

"ندی پر جا رہا ہوں!"

"شکار کھیلنے؟" بڑے ٹھاکر نے خوش ہو کر پوچھا۔

"نہیں تایا جی۔" دلیپ نے موقعہ پا کر کہنا شروع کیا۔ "ایک نہر کھدوانے کی سوچ رہا ہوں۔"

"سوچتے رہو بیٹا۔" ٹھاکر جی پھر اپنی چال میں ڈوب کر بولے۔ "سوچنا بہت اچھی بات ہے۔ دیکھو بیٹا اگر اب میں اپنی شطرنج کی چال کے بارے میں متواتر نہ سوچوں تو بازی ہار جاؤں۔"

"مگر تایا جی۔" دلیپ نے ذرا آگے بڑھ کر کہا۔ "محض سوچنے سے کام نہیں چلے گا۔ مجھے اس نہر کے لئے آپ کی مدد چاہیئے۔"

بڑے ٹھاکر بڑی شفقت سے دلیپ کو سمجھانے لگے۔ "اب بیٹا تم جانتے

ہو، یہ نہر مجھ سے کھودی نہیں جائے گی۔ یہ تو کسانوں کا کام ہے۔ پاسیوں اور چماروں کا اور کولیوں کا۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تو کیوں اس قدر اس نہر کے پیچھے پڑا ہے؟"

"تایا جی۔ . . . نہر سے سوکھے کھیتوں میں پانی آ جائے گا۔ فصل بڑھ جائے گی۔ ہمارے کسان خوشحال ہو جائیں گے۔"

بڑے ٹھاکر چال روک کر بولے "کسان خوشحال ہو جائیں گے تو ہماری تو آفت آ جائے گی۔ کیوں کرپا شاہ۔ ذرا دیپو کو سمجھاؤ۔ اگر کسان خوشحال ہو گئے تو ہماری بے گار کون بھرے گا؟ نذرانہ کون دے گا؟ مال گذاری کون دے گا؟"

"مگر تایا جی۔ وہ تو۔ . . . " دلیپ نے کہنا شروع کیا۔ کہ . . . "

بڑے ٹھاکر بیزار ہو کر فوراً ہی بول اٹھے "تو بڑا بیوقوف ہے۔ مہاجن! اسے سمجھاؤ۔ ہمیں خوشحال کسان نہیں چاہئیں۔"

بڑے ٹھاکر کی شہہ پا کر مہاجن بولا۔ "ٹھاکر جی بالکل ٹھیک کہتے ہیں چھوٹے سرکار! ہمارے وہاں ایک کہاوت ہے۔ وہ تو مجھ کو یاد نہیں۔ اس وقت پر اس کا مطلب یہ ہے کہ زمیندار خوشحال ہو تو رنڈی رکھتا ہے۔ کسان خوشحال ہو تو لاٹھی لے کر ہمسایہ کا سر پھوڑتا ہے۔ اب بیٹا کیا تم چاہتے ہو تو کہ گاؤں میں روز، روز، دنگا ہوتا رہے؟"

"یہ تو میں نہیں چاہتا شاہ جی مگر۔ . . . . . ."

"تو اس نہر کے معاملے کو ٹھپ کر دو۔" مہاجن بولا "یہ کسان جب تک غریب رہیں گے وہ ہماری جوتیاں اٹھائیں گے۔ ان کو تم نے ذرا خوشحال بنایا، اور وہ تمہارے سر پر چڑھ کر بیٹھ جائیں گے۔ یہ لو ٹھاکر فیل کی چال!"

دلیپ نے کہا "ایک دن آپ کو یہ چال بہت مہنگی پڑے گی!"

بڑے ٹھاکر نے چونک کر اوپر دیکھا۔ مگر دلیپ تیز تیز قدموں سے دیوان

خانے سے باہر نکل چکا تھا۔ بڑے ٹھاکر نے پھر اپنی توجہ شطرنج پر مرکوز کرتے ہوئے مہاجن سے کہا: "ابھی بچہ ہے۔ آہستہ آہستہ خود ہی سمجھ جائے گا!"

"کیوں نہیں! کیوں نہیں!" مہاجن ہاں میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "سنگراموں کے راجپوتی خاندان سے ہے۔ سات پشتوں سے زمینداری ورثے میں چلی آ رہی ہے۔ زمینداری خود اپنے پینترے سکھا دے گی!"

دلیپ غصے سے پاؤں پٹکتا ہوا جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا۔ اصطبل کی طرف چلا گیا۔ وہاں جا کر اس نے اپنے چہیتے گھوڑے کشور پر پیار سے ہات پھیرا۔ پھر اس کی باگ سائیس کے ہاتھ میں دے کر بولا۔ "اسے پھاٹک کے باہر لے جاؤ۔" اور خود چابک ہلاتا ہوا، نیم تاریک ڈیوڑھی سے گذرتا ہوا پھاٹک کے باہر گیا۔ اسے ڈیوڑھی میں گذرتے دیکھ کر داروغہ جی اور چوکیدار مؤدب کھڑے ہو گئے۔ مگر اس نے کسی کی طرف نہیں دیکھا اور سیدھا باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد سائیس گھوڑے کو تیار کر کے اسے باہر لایا۔ دلیپ، کشور پر سواری کرنے والا تھا کہ اسے سامنے سے ڈاکیہ سائیکل تیزی تیزی سے چلا کر حویلی کی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ دلیپ رک گیا۔ سائیکل روک کر ڈاکیے نے اپنی جیب سے ایک تار نکالا اور دلیپ کو دیتے ہوئے بولا۔ "سیدھا دھن پت شوگر ملز کے پوسٹ آفس سے سائیکل چلا کر چلا آ رہا ہوں۔ پوسٹ ماسٹر صاحب نے بولا۔ فوراً دے کر آؤ۔ بہت ضروری تار ہے!"

دلیپ نے لفافہ پھاڑ کر تار کھولا۔ لکھنؤ سے اس کے دوست کالی چرن شرما کا تار تھا۔ دلیپ نے گردن کے اشارے سے ڈاکیے کو جانے کی اجازت دی اور اور فوراً تار کا مضمون پڑھ کر گہری سوچ میں ڈوب گیا اور گھوڑے پر سوار ہونے کے بجائے واپس پھاٹک کے اندر جانے لگا۔ تو سائیس نے پوچھا۔ خیریت تو ہے،

سرکار ؟" مگر دلیپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تار میں جو کچھ تھا وہ اس کے لیے کوئی حادثہ نہ تھا۔ ایک متوقع امر تھا۔ پھر بھی تار پڑھتے ہی اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ حالانکہ تار میں وہی کچھ بتایا تھا جس کا اسے ایک عرصے سے خدشہ تھا۔ پھر بھی حادثے اور حادثے کی توقع میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اور توقع میں توقع کے خلاف چاہے وہ ایک فی صدی ہی کیوں نہ ہو یا ایک فی صدی کا ہزارواں حصّہ کیوں نہ ہو۔ پھر بھی ایک ہلکی سی امید تو رہتی ہے کہ شاید یوں نہ ہو۔ ممکن ہے یوں نہ ہو۔ حادثہ وقوع پذیر نہ ہو۔ اور زندگی خیریت سے گذر جائے۔ مگر اس تار نے امید کا آخری تختہ قدموں کے نیچے سے گھسیٹ لیا تھا۔ اور اب وہ سب لوگ ایک ہی کھائی میں جا گرے تھے۔!

دلیپ غلام گردش طے کر کے دیوان خانے میں پہنچا، تو اس نے بڑے ٹھاکر اور مہاجن کو بدستور شطرنج میں ڈوبا ہوا پایا۔ دلیپ وہ کاغذ کا پرزہ لے کر بڑے ٹھاکر جی کے سر پر پہونچ گیا اور صاف واضح لہجہ میں بولا۔

"لکھنؤ سے تار آیا ہے۔ تایا جی! گورنمنٹ نے زمینداری ختم کر دی ہے!"

یہ خبر سنتے ہی ٹھاکر گھبرا کر تخت سے اٹھے اور ان کے اٹھتے ہی شطرنج کی بساط الٹ گئی۔ اور شطرنج کے سارے مہرے بادشاہ اور ملکہ، فیل اور اسپ اور پیادے لڑھک کر فرش پر قلابازیاں کھانے لگے۔ بڑے ٹھاکر سر سے پاؤں تک کانپتے ہوئے پھٹی پھٹی نگاہوں سے چپ چاپ دلیپ کو گھورتے رہے۔ پھر ایکدم چیخ کر بولے۔

"زمینداری ختم ہو گئی۔ ہو نہیں سکتا! ارے میں نے کانگریس کو دس دفعہ چندہ دیا تھا۔ ستیہ آگرہ کے زمانے میں جب، جب یہ کھدر داری میرے پاس آئے میں نے ہمیشہ دل کھول کر چندہ دیا تھا۔"

دلیپ بولا۔" آپ نے چندہ دیا تھا۔ تایا جی! رشوت تو نہیں دی تھی۔"

"چپ رہو۔ بدزبان گستاخ!" بڑے ٹھاکر کڑک کر بولے۔ پھر ایکدم تخت سے اتر کر دیوان خانے سے باہر بھاگے اور صحن میں جاکر اپنے سر کے بال نوچتے ہوئے اپنا ماتھا پیٹنے لگے۔ اور زور، زور سے چلّانے لگے۔ ارے ہم لٹ گئے تباہ ہو گئے۔ ستیاناس سوا ستیاناس۔ خاک میں مل گئے۔ باقی تو نہ رہا کچھ بھی۔ ارے میرے بھگوان۔ مجھ کو تو جیتے جی مار ڈالا۔ اس کانگریس نے۔ ارے چھگن، منن، نبّن، چنن، جگن۔ کہاں مر گئے تم سب؟" بڑے ٹھاکر جی کی آہ و زاری خاندان کے سب لوگ بھاگم بھاگ صحن میں دوڑ دوڑ کر آنے لگے۔ ٹھکرائین کچھ جانے بوجھے بغیر ہی زنانخانے سے روتی، سر پیٹتی، پچھاڑیں کھاتی دھاڑتی مارتی ہوئی آنے لگیں۔

"کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ راجی۔" جوہی نے کامنی سے پوچھنے کی کوشش کی۔

"لکھنؤ سے تار آیا ہے!" بڑے ٹھاکر کاغذ کا پرزہ ہوا میں ہلا کر چیخے۔ "ہائے ہائے لکھنؤ سے تار آ گیا۔" پدمنی دو ہتّڑ مار کر بولیں۔ "وہ تو آنا ہی تھا۔" کملا اپنے بال نوچتے ہوئے بولی۔ "صبح سے میرا ماتھا ٹھنک رہا تھا۔ رات کو میں نے ۔۔۔"

"وہ کیسے نہ آتا؟" لکشمی چلّا کر بولیں۔ "میں نے تو رات کو خواب میں دیکھا میرے پتا جی ٹھاکر وکرم سنگھ چل بسے!" جرنیل چاچا نے اکدم خائف ہو کر پوچھا مرغ ابھی تک ان کی بغل میں تھا۔

"ہائے میرے بھیّا!" ٹھاکر جین سنگھ اپنے مصاحبوں کی طرف گھوم کر کہنے لگے۔ "حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔"

جب ٹھاکر وکرم سنگھ کے مرنے کی آوازیں چاروں طرف سے آنے لگیں تو بڑے ٹھاکر نے روتے اور چلّاتے ہوئے کہا۔

"ارے ٹھاکر وکرم سنگھ نہیں۔"

"تو پھر، میری بہن سرسوتی ہوگی۔" پدمنی سر پیٹ کر بولی۔" اسے کینسر تھا۔ ہائے ہائے سرسوتی!" عورتوں نے وکرم سنگھ کا نام چھوڑ کر سرسوتی کا نام لے کر دوبارہ رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ اس شور وغل میں کوئی بڑے ٹھاکر کی نہ سن سکتا تھا۔ کیونکہ عورتیں رو رہی تھیں اور انہیں روتے دیکھ کر بچے بھی رونے لگے۔ اس بھگدڑ میں جرنیل چاچا کا مرغ ان کے ہات سے نکل گیا اور چڑی مار چاچا کا پنجرا ان کے ہات سے چھوٹ گیا اور مرغ لڑھکتے ہوئے پنجرے کے اوپر پر پھڑپھڑاتے ہوئے چلانے لگا اور پنجرے کے اندر ہیرامن طوطا خوف سے ٹیں ٹیں کرنے لگا۔ اور جرنیل چاچا اپنا مرغ بچانے کے لئے اور چڑی مار چاچا اپنا پنجرا لینے کے لئے دو مخالف سمت سے بھاگے اور ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو کر زمین پر نیچے جا گرے۔ پنجرا لڑھکتا ہوا پرتھوی راج کی دونوں ٹانگوں کے بیچ میں چلا گیا۔ تو زمین پر لیٹے لیٹے ایک طرف سے چڑی مار چاچا نے اپنا پنجرہ پکڑنا چاہا اور دوسری طرف سے جرنیل چاچا نے اپنا مرغ اور اسی کوشش میں دونوں نے پرتھوی راج کی ٹانگیں گھسیٹ لیں۔ اور وہ بھی اپنی ڈور اور چرخی پتنگ لئے نیچے گر گیا اور اس کا ایک دو بلکا پتنگ پھٹ کر جرنیل چاچا کی گردن میں آ دیاں ہو گیا اور دوسرا چڑی مار چاچا کی گردن میں اور ڈور بہت سے پاؤں میں الجھتی گئی۔ اور کھینچنے میں ڈور بڑے ٹھاکر کے پاؤں زخمی کر گئی۔ کیونکہ وہ توست کا دھاگا نہ تھا۔ پتنگ کی مانجھا لگی ڈور تھی۔ بڑے ٹھاکر کے پاؤں سے خون نکل آیا۔ اور وہ چلا کر کہنے لگے۔ "خون! خون!! بھیا ڈور چھوڑ دو۔" بڑے ٹھاکر چلائے۔

"خون! خون!! لکھنؤ میں خون ہو گیا۔ ہائے بھیا۔ زور آور سنگھ ہمکا چھوڑ گئے!!" لکشمی نے دور ہی شور وغل کے درمیان بڑے ٹھاکر کی آواز سے اندازہ لگایا

اور اپنا سینہ کوٹنے لگی۔

"ہائے بھیا زور آور سنگھ ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔" عورتوں نے سرسوتی کا نام پھر پیٹنا چھوڑ کر اب زور آور سنگھ کی سیاپتی شروع کر دی۔

دلیپ نے تار کا کاغذ بڑے ٹھاکر کے ہاتھ سے چھین لیا اور حویلی کی مرکزی عمارت کی اونچی سیڑھیوں پر کھڑا ہو کر بولا۔

خاموش!

سب لوگ دلیپ کی طرف دیکھنے لگے۔ یکایک چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ "ہمارا کوئی رشتہ دار لکھنؤ میں نہیں مرا ہے!" دلیپ نے کہا۔ "اس تار میں کسی کی موت کی خبر نہیں ہے۔ سب خیریت ہے!"

"سب خیریت ہے تو پھر یہ شور شرابہ کس لئے ہے۔" چڑیا مار چاچا اپنا پنجرہ سنبھالتے ہوئے بولے۔

شور شرابے کا ذکر سن کر جوگیندر بولا "شراب! شراب کہاں ہے؟" انہوں نے شراب کی خالی بوتل صحن کے فرش پر پھینکتے ہوئے پوچھا۔

"اس تار میں لکھا ہے۔" دلیپ گرج کر بولا۔ "گورنمنٹ نے زمینداری ختم کر دی ہے۔"

جوگیندر نے اپنے کمرے میں ایزل پہ رکھی ہوئی نامکمل تصویر کو دیکھا اور نشے میں جھومتے ہوئے اس پر آڑی ترچھی دو لکیریں برش سے کھینچ دیں۔ پھر خالی بوتل کو اپنے منہ سے لگائے فرش پر گر گیا، اور گر کر سو گیا۔

مرغ باز چاچا اپنے اصیل مرغ کے پروں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے میاں صدرالدین سے کہہ رہے تھے۔" ارے میاں۔ میں تو پہلے روز سے کہتا تھا۔ کہ یہ آزادی، آزادی پکارنے والے کوئی شریف لوگ نہیں ہیں۔ ان کو چندہ مت دو۔ مگر بڑے ٹھاکر بھیا کب کسی کی سنتے ہیں۔ ان رذیلوں نے آزادی ملتے ہی ہم شریفوں اور رئیسوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا ہے۔ مگر یہ احمق نہیں جانتے کہ اگر زمینداروں کو ختم کر دیا تم نے تو اس ملک کا کلچر تباہ ہو جائے گا۔ مرغ بازی کا شریف فن فنا ہو جائے گا۔"

اور شاعر چاچا اپنے مصاحبین سے کہہ رہے تھے۔" اگر حکومت کے قلم میں طاقت ہے تو میرے قلم میں بھی طاقت ہے۔ میں اس قانون کے خلاف چھ سو شعر کی وہ ہجو لکھوں گا وہ ہجو لکھوں گا کہ حکومت کو چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ اور وہ خود جھک مار کے زمینداری ہمیں واپس کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔

جونہی رسوئی کے پچھواڑے سے نکل بھاگی اور ٹیلوں سے اترتی ہوئی دوڑتی ہوئی دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے چلّاتی ہوئی گاؤں میں داخل ہوئی۔ سب سے پہلے اسے شامو کمہار نظر آیا۔ جو اپنے چکے پر بیٹھا برتن بنا رہا تھا۔ وہ ایک لحظے کے لئے رُکی اور اس نے چلّا کر کہا۔

"چاچا زمینداری ختم ہو گئی ۔ لکھنؤ سے تار آیا ہے ۔"

کمہار کا چہرہ کھل اٹھا جیسے صدیوں کی پرتیں اس کے چہرے سے اتر گئیں۔

"سچ ہے؟" وہ حیرت زدہ ہو کر چیخا۔

"میرے سامنے تار آیا ہے" ۔ جوہی اپنی اہمیت جتاتے ہوئے بولی "اور میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ حویلی کے ٹھاکر سر پیٹ رہے ہیں۔"

ایک لمحہ کے لئے کمہار خاموش رہا۔ پھر اس نے اپنے چکنے کو زور سے ایک گردش دی اور لہک کر بولا۔

"چلا جور سے چکا ۔ لگا جمینداری کو دھکا !"

جوہی اتنی خبر سنا کر آگے بھاگی تو بھو جیار نے یہ خبر سنتے ہی ڈھول دیوار سے اتار کر گلے میں ڈال لیا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ اور ڈھول پیٹ پیٹ کر اپنی برادری والوں کو خبر کرنے لگا۔ جوہی آگے بھاگی۔ آگے مینیا موسی کا گھر تھا مینیا دو سال ہوئے بیوہ ہو چکی تھی۔ مینیا کا بڑا لڑکا جگنا۔ جوہی کو بہت چاہتا تھا۔ مگر جگنا بھی اپنے مرحوم باپ کی طرح ایک کھیت مزدور تھا اور جوہی حویلی والوں کی باندی تھی۔ بالکل راجہ بھوج اور گنگوا تیلی والا معاملہ تھا۔ جگنے کے پاس اگر اپنی زمین ہوتی ۔ دو وقت کی نہ سہی ایک وقت کی روٹی ہی کا سہارا ہوتا ۔ تو وہ جوہی پر اپنی چاہت کا اظہار کر دیتا۔ اس لئے وہ جوہی کو دور ، دور ہی سے چاہتا رہا۔ اس کی ماں مینیا کے پاس دو دودھیلی گائیں تھیں۔ جن کا دودھ ٹھاکروں کی حویلی میں جاتا تھا۔ اور وہاں اس کی ملاقات اکثر جوہی سے ہو جاتی تھی۔ ہر روز جگنا یہ دودھ لے کر ٹھاکروں کی حویلی میں جاتا تھا۔ وہ ڈھکی چھپی نگاہیں، وہ دبی دبی آہیں، وہ جھجکتے ہوئے، سہمے ہوئے سے فقرے، جیسے اپنی محبت کا راز کہنا چاہتے ہوں۔ مگر ہمت نہ پاتے ہوں۔ یوں تو جوہی حویلی والوں کی

باندی تھی۔ وہ لوگ اس کے جسم و جان کے مالک تھے۔ مگر ہولے، مولے جوہی کا دل جگتا کی طرف مائل ہونے لگا۔ اسے جگتے کی گردن میں کالے دھاگے سے بندھا ہوا چاندی کا تعویز بہت اچھا لگتا تھا۔ جسے منیا موسی نے کسی فقیر سے حاصل کر کے اپنے بیٹے کے گلے میں ڈالا تھا۔ کیونکہ جگتا پہلوٹی کا تھا اور پہلوٹی کا بچہ ماں کو بے حد عزیز ہوتا ہے۔ تین سال سے جگتے پر جوانی آئی تھی۔ اور جوہی کو جگتے کے طاقتور بدن سے ایسی مہک آتی تھی کہ وہ جگتے کو اپنے قریب پاکر بڈھال سی ہونے لگتی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ آنکھیں موندلے اور اپنے آپ کو جگتے کی مضبوط باہوں کے گھیرے کے حوالے کر دے۔ کیسی عجیب سی خوشبو تھی۔ کچھ کچھ شہد اور برسات میں بھیگی ہوئی گھاس کی خوشبو سے ملتی جلتی۔ ٹھاکروں کا بیٹا مہندر اتنا صاف ستھرا رہتا تھا۔ اتنے اجلے کپڑے پہنتا تھا۔ ہر وقت لیونڈر اور کوٹوں میں بسا رہتا تھا۔ تو بھی اس کے جسم سے ایسی مست کر دینے والی خوشبو نہیں آتی تھی۔ لیکن وہ جگتے کو کچھ بتا نہیں سکتی تھی اور بتانے کا فائدہ بھی کیا تھا۔ جگتے کے پاس ایک پھوٹی کوڑی نہ تھی۔ ایک بسوہ زمین نہ تھی۔ اپنا الگ سے ایک چھپر تک بسانے کا کوئی امکان نہ تھا۔ اس لئے ہولے ہولے جگتے کے بدن سے یہ خوشبو اڑ جائے گی۔ اس کے شہد کی ایک ایک بوند چوس لی جائے گی اور برسات میں بھیگی ہوئی گھاس قدموں تلے روندی جائے گی اور ایک دن جگتا بھی ہڈیوں کا پنجر ہو کر اپنے مرحوم باپ کی طرح خاک میں مل جائے گا۔ کہ کھیت مجور کی یہی زندگی ہے۔!

جب جوہی منیا کے گھر پہنچی تو ایک گائے کو منیا دوہ رہی تھی۔ دوسری کو جگتا اور جگتے کا سب سے چھوٹا بھائی دودھ کے لئے ضد کرتا ہوا رو رہا تھا۔ اس کی ماں نے زور سے . . . . . چانٹا مارا اور جھلا کر بولی " روز اسی وقت ضد

کرتا ہے۔ جب دودھ ٹھاکروں کے لئے نکالا جاتا ہے اور اس جنم جلے موئے سے کہتی ہوں، یہ دودھ تیرے لئے نہیں ٹھاکروں کے لئے ہے۔"

جوہی نے خوشی سے چلا کر کہا۔ "موسی دودھ بچّے کو دیدے۔ زمینداری ختم ہو گئی۔" جگتے نے چونک کر دیکھا۔ دُوھتے دوھتے اس کا ہاتھ رک گیا۔ ایک طرف بندھا ہوا بچھڑا اپنی ماں کے تھنوں سے دودھ نکلتے دیکھ کر زور زور سے ڈکارنے لگا۔ اور رسی تڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ جیسے وہ ہر روز کرتا تھا گائے نے ایک نظر اپنے بچھڑے پر ڈالی۔ دوسری جوہی پہ۔ پھر پلیٹ کر دیوار کی طرف دیکھنے لگی۔

"نہیں!" مینا نے سر ہلا کر کہا جیسے اسے یقین نہ آرہا ہو۔

"ہاں، ہاں!" جوہی خوشی سے بولی۔ ابھی حویلی میں تار آیا ہے۔ ٹھاکروں میں بپتس پڑ گئی ہے!"

جگنا لپک کر بندھے ہوئے بچھڑے کی طرف بڑھا۔ اس نے رسّی کھول دی، رسّی کھلتے ہی بچھڑا ہمک کر آگے بڑھا۔ اور اپنی ماں کے تھنوں سے لگ کر چپر چپر دودھ پینے لگا۔ گائے بڑے پیار سے اس کا بدن چاٹنے لگی۔

"دیکھ ٹھیک ٹھیک بتا دے۔" مینا کو جیسے اعتبار نہ آرہا ہو۔

جگتے نے ہاتھ بڑھا کر اپنی ماں کے ہاتھ سے مٹی کا برتن چھین لیا اور اپنے روتے ہوئے بھائی کے منہ سے لگا کر بولا۔ "جوہی جھوٹ نہیں کہہ سکتی۔ میں نے بھی سنا تھا۔ جمیندارى ختم ہونے والی ہے۔ ہم کھیت مجوروں کو بھی جمین ملے گی۔"

جوہی آگے چلی گئی۔ چند قدم آگے جانے کے بعد جوہی کو احساس ہوا جیسے کوئی ہولے ہولے اس کے پیچھے آرہا ہو۔ جوہی نے چور نگاہوں سے پیچھے

مڑ کر دیکھا۔ وہ جگنا تھا۔ کچھ عجب شرماتا جھجکتا چل رہا تھا۔

جو ہی آگے گاؤں جانے کی بجائے ایک طرف کو مڑ گئی۔ جدھر پرانا تالاب تھا۔ جگنا بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

جو ہی پرانے تالاب کے کنارے پہنچ کر جامن کے پیڑ کے نیچے کھڑی ہو گئی اور کنکر اٹھا کر تالاب میں پھینکنے لگی۔ غڑاپ کی آواز کے ساتھ کنکر پانی میں ڈوب گیا۔ پھر اسے اپنے قریب ایک سایہ سا لرزتا محسوس ہوا۔ اور وہی شہد اور برسات میں بھیگی ہوئی گھاس والی خوشبو اس کے نتھنوں میں آنے لگی۔ اور اسنے مڑے بغیر محسوس کر لیا کہ جگنا یہیں کہیں اس کے بالکل قریب کھڑا ہے۔

جگنے نے ایک پتھر اٹھایا۔ یہ ایک چھوٹا سا چپٹا پتھر تھا۔ اس نے اسے ہتھیلی پر رکھا اور اسے پرکھتے ہوئے بولا "اب مجھے جمین مل جائے گی۔ سرکار ٹھاکروں سے جمین لے کر ان لوگوں کو جمین دے گی۔ جن کے پاس جمین نہیں ہے۔ اس لئے مجھے جمین ضرور ملے گی۔!"

جو ہی چپ رہی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مگر وہ چپ رہی۔ جواب میں اس نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ صرف ایک کنکر اٹھا کر تالاب میں پھینک دیا۔

جگنا بولا "میرے ہاڈ جوان ہیں اور میرا دل مضبوط ہے اور میں اپنی دھرتی سے صرف دو وقت کی روٹی ہی نہیں، چاندی کے گہنے بھی اگا سکتا ہوں۔ میں جمین کھود کے سب کچھ نکال ڈالوں گا جو میری گھر والی کو چاہیئے!" اتنا کہہ کر جگنے نے بازو گھما کر اس پتھر کو ایسے زاویئے سے تالاب کی سطح پر کھینچ مارا کہ پتھر جو ہی کی نگاہوں کے سامنے تالاب کی سطح پر چھپلتا ہوا، ایک کنارے سے تیرتا ہوا دوسرے کنارے تک چلا گیا۔

دیر تک جوہی کا دل تالاب کی سطح کی طرح لرزتا رہا۔ پھر جب اس نے مڑ کر دیکھا تو جگتا غائب ہو چکا تھا۔

اس شام اگر کوئی ہوائی جہاز سے دیکھتا تو اسے معلوم ہوتا کہ حویلی کی سب سے اونچی برجی پر لہرانے والا آزادی کا جھنڈا۔ آج گاؤں کی چوپال پر لہرا رہا ہے اور آج چوپال میں اتنی ہی روشنی ہے جتنا حویلی میں اندھیرا ہے۔ نہ صرف ایک چوپال میں بلکہ آس پاس کے علاقے کی سینکڑوں چوپالوں میں اسے روشنی کے کئی دیئے نظر آئے۔ دور اوپر دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے رات کے اندھیرے میں سینکڑوں ہاتھ مشعلیں لے کر اوپر اٹھے ہیں۔ اور دھرتی کے تاریک سینے کو روشنی کی مالائیں پہنا رہے ہیں۔

نیچے پالن گڈھ کے چوپال میں سینکڑوں کسان مرد عورتیں بچے جمع ہو کر گا رہے تھے۔ اور ناچ رہے تھے۔ وہ اپنے جسم و جاں کے رویئں رویئں میں ایک نئی تازگی محسوس کر رہے تھے۔ اور آج ان کی خوشیوں بھری رات میں حویلی کے ٹھاکروں کا صرف ایک فرد شریک تھا۔ دلیپ، جو دوسرے کسانوں کی طرح گاڑھے کے موٹے جھوٹے کپڑے پہنے ہوئے چوپال میں جھوم جھوم کر ناچ رہا تھا

دلیپ منہ اندھیرے ہی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر دھومی ندی کے کنارے کنارے جنگل کو نکل گیا تھا۔ دو تین بار اس نے بندوق چلنے کی آوازیں سنیں۔ مگر وہ اپنے سفر کے تقشے کے لئے ذہنی طور پر اس قدر مصروف تھا کہ اس کے دل و دماغ

نے اس طرف بالکل توجہ نہیں دی۔ کچھ دیر کے بعد اس نے قریب ہی کی ایک دلدل میں اونچی گھاس کے اندر سے ایک عورت کی چیخ سنی۔ اور وہ جلدی سے گھوڑا دوڑاتے ہوئے اس طرف گیا۔ جدھر سے چیخ کی آواز آئی تھی۔

دلدل کے کنارے اسے ایک رائفل ملی اور ایک جھولا اور ایک بیگ۔ پھر اسے دلدل کی جھاڑیوں میں کمر تک دھنسی ہوئی لڑکی نظر آئی۔ جس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ بال سنہرے تھے اور وہ اپنے دونوں ہات ہلا ہلا کر خائف ہو کر زور زور سے مدد کے لئے پکار رہی تھی۔

دلیپ جلدی سے گھوڑے سے اترا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اگر وہ خود دلدل میں اترتا ہے۔ تو اس بات کا گمان ہے کہ وہ خود بھی لڑکی کے ساتھ دلدل میں پھنس جائے گا۔ کوئی رسہ وغیرہ بھی قریب نہ تھا کہ اسے لڑکی کے قریب پھینک کر اسے دلدل میں سے واپس گھسیٹ لیتا۔ دلیپ کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ لڑکی کمر تک دلدل میں کر تک دھنس چکی تھی اور لمبی لمبی دلدلی گھاس کے خوشے اور آبی جھاڑیاں اپنی شاخوں اور جڑوں سمیت ہزار پائے کے شکنجے کیطرح اسے نیچے دلدل کے نیچے گھسیٹ رہی تھیں اور اس کے چاروں طرف کیچڑ اور پانی کے بلبلے سے چھوٹ رہے تھے۔ اور وہ بالکل بے بس ہو کر خوف سے چیخ رہی تھی

دلیپ کے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد اسے ڈھاک کا ایک پیڑ نظر آیا۔ جو کچھ فاصلے پر دلدل کے کنارے جھکا کھڑا تھا۔ اس درخت کی دو بڑی بڑی شاخیں دلدل کے اوپر سایہ کئے ہوئے تھیں۔ ایک شاخ تو خاصی اونچی تھی۔ لیکن دوسری شاخ کافی نیچی تھی۔ اور دلدل اس سمت پر تھی جہاں لڑکی ڈوب رہی تھی۔ دلیپ نے چند لمحوں میں اندازہ لگا لیا کہ اگر ڈھاک کے پیڑ کی نچلی شاخ پر چڑھ کر بہت آگے کو جا کر ہات نیچے کو گرا کر لڑکی کو اوپر کھینچنے کی کوشش کی جائے تو ممکن ہے وہ لڑکی

کو بچانے میں کامیاب ہو جائے۔ اس صورت میں گو یہ اندیشہ بھی تھا کہ ڈھاک کی شاخ ٹوٹ جائے اور وہ خود دلدل میں جا گرے۔ مگر اس نے اس خطرے کو مول لینا مناسب سمجھا اور بھاگ کر ڈھاک کے پیڑ پر چڑھ گیا اور پھر اپنا وزن تولتا اور شاخ کا ردعمل دیکھتا آہستہ آہستہ شاخ پر لیٹ کر آگے کو کھسکتا گیا۔ شاخ اس کے بوجھ سے جھکتی گئی اور لچکتی گئی اور وہ بہت ہی احتیاط سے آگے بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ وہ ان جھاڑیوں کے اوپر لٹک گیا جہاں وہ لڑکی ڈوب رہی تھی۔ اوپر لٹک کر دلیپ نے شاخ میں ٹانگیں پھنسائیں اور بائیں ہات سے شاخ کو مضبوطی سے پکڑ اپنے دائیں ہات کو نیچے لٹکا دیا۔ اور لڑکی کو پکڑنے کی کوشش کی۔ دو تین بار اس کا داؤ خالی گیا اور شاخ جھول جھول گئی۔ اور بہت سے پتے اور چھوٹی چھوٹی ٹہنیاں ٹوٹ کر دلدل میں جا گریں آخر بے حد جھک کر چوتھی بار کوشش کر کے اس کے ہاتھ نے اس لڑکی کے ہاتھ پکڑ ہی لیے۔ اور پھر اس نے زور لگا کر لڑکی کو اوپر کھینچنا شروع کیا ایک دو دفعہ اوپر کھینچتے کھینچتے شاخ کے چرچرانے کی ہلکی سی آواز پیدا ہوئی۔ اور عین اسی وقت دلیپ نے اپنے بازو کی گرفت ڈھیلی کر دی۔ اس طرح کام کرتے کرتے۔ کبھی بازو ڈھیلا چھوڑتے اور کبھی زور لگاتے وہ آہستہ آہستہ لڑکی کو دلدل سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ دلدل سے نکال کر دھیرے دھیرے لٹکتی ہوئی لڑکی کو اپنے جسم کی پوری قوت لگا کر اسے شاخ تک کھینچ لایا۔ اس بات کا خطرہ تھا کہ کہیں شاخ دو آدمیوں کا بوجھ نہ سہار سکے اور ٹوٹ کر نیچے گر جائے۔ مگر خیریت رہی۔ لڑکی کیچڑ میں لت پت، مگر زندہ صحیح وسلامت ڈھاک کی شاخ تک آ گئی۔ دلیپ آہستہ آہستہ اسے سہارا دیتے ہوئے۔ شاخ کے پیچھے تنے کی طرف کھسکنے لگا اور جبکہ وہ دونوں شاخ کے آدھے راستے میں ہی تھے۔ شاخ زور سے چرچرانے لگی اور دلیپ نے عین اسی وقت جھپٹ کر بازو سے لڑکی کو پکڑا اور اچھل کر اوپر کی شاخ سے لٹک گیا۔ دوسرے

لمحے وہ نیچے والی شاخ پیڑ سے ٹوٹ کر اڑاڑا دھم کرتی ہوئی دلدل میں جا گری اور لڑکی اور دلیپ اوپر والی شاخ پر ہوا میں جھولتے رہ گئے۔

چند لمحوں کے بعد جب دلیپ کے اوسان بجا ہوئے تو اس نے اونچی شاخ کے تنے کو غور سے دیکھا۔ اپنے بازو سے جھولتی ہوئی لڑکی کو دیکھا چند مناسب لفظوں میں اس نے لڑکی کو ڈھارس دی اور ہمت بندھائی اور پھر آہستہ آہستہ اس بڑی شاخ پر گھسٹتا ہوا پیڑ کے تنے تک پہنچ گیا۔

پیڑ کے تنے تک پہونچتے ہی لڑکی نے اس کا بازو چھوڑ دیا اور اپنے دونوں بازو پھیلا کر پیڑ کے تنے سے چمٹ گئی اور سسک سسک کر خوشی سے رونے لگی۔ کچھ دیر کے بعد دلیپ اسے سہارا دے کر درخت کے نیچے اتار لایا۔ لڑکی کمر سے نیچے کیچڑ میں لت پت تھی اور خود دلیپ کا سارا جسم پسینے میں تر بتر تھا۔ پیڑ کے نیچے کچھ دیر تک آرام کر لینے کے بعد دلیپ اس لڑکی کو ندی کے کنارے لے گیا۔ تاکہ لڑکی اپنا لباس وغیرہ دھو سکے اور خود وہاں سے ہٹ گیا۔

کچھ عرصے کے بعد جب وہ واپس پہنچا تو لڑکی نے اپنا لباس دھو لیا تھا۔ اور دھوپ میں بال سکھا رہی تھی۔ اس کے سنہرے بالوں میں سرخی کی ایک ہلکی سی جھلک تھی اور بال جھٹکتے وقت ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک چھوٹی سی گلابی چھتری بار بار کھلتی اور بند ہوتی ہو۔

لڑکی نے اسے بتایا کہ اس کا نام لولا میک گی ہے۔ وہ لکھنؤ میں ایک کیبرے گرل تھی اور یہاں، دس دن سے ٹھاکر بلرام سنگھ کے وہاں مہمان تھی۔ آج سویرے سویرے ہی وہ ڈک شوٹنگ کے لئے نکلی تو یہ حادثہ پیش آیا۔

ٹھاکر بلرام سنگھ، دلیپ کو یاد آیا۔ دھنپت رائے ملز کا مینجر تھا اور بے حد رنگین مزاج تھا۔ شوگر مل میں اس کے کچھ حصے بھی تھے اور بہت بڑی زمینداری بھی

تھی۔ اس نے غور سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ لڑکی نے اپنی نگاہیں جھکا لیں اور اس کا شکریہ ادا کرنے لگی اور دبی زبان میں۔

"ٹھاکر بلرام سنگھ کو تم کب سے جانتی ہو؟" دلیپ نے پوچھا۔

"کوئی ایک سال سے۔" لولا بولی۔

"وہ تمہارے ساتھ ڈک شوٹنگ پر کیوں نہیں آیا؟"

"وہ یہاں ہے نہیں۔ لکھنؤ گیا ہے۔"

"تمہیں اکیلے نہیں آنا چاہیئے یہاں!"

"اب کبھی اکیلی نہیں آؤں گی۔ وعدہ کرتی ہوں!"

دلیپ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ "چلو تمہیں بلرام سنگھ کے بنگلے پر چھوڑ آؤں!"

دلیپ نے اپنے ساتھ لولا کو گھوڑے کی پیٹھ پر بٹھا لیا۔ اور گھوڑا ندی کے کنارے سرپٹ دوڑنے لگا۔

⁂

سرکیوں والے دالان میں بڑی ٹھکرائن نے انگڑائی لی۔ دو تین جماہیاں لیں۔ پھر پاندان کھول کر اور اسے خالی پاکر کچن کی طرف منہ کر کے چلائی۔

"ارے بیٹا! پاندان میں پان نہ چھالیاں۔ صبح سے پان کا ایک بیڑا منہ میں نہیں گیا۔ کہاں جا کے مر گئی تو؟"

لکشمی اپنے تخت پر پڑے پڑے چیخی۔ "اری دھنیا۔ صبح سے بڑی بڑی چیخ رہی ہوں کب کی تجھ کو۔ ایک کٹوری میں گلاب کا عرق بھر کے لا۔ کلی کروں۔" پھر ٹھکرائن کی طرف دیکھ کر بولی۔ "جانے کیا بات ہے جب تک صبح سویرے اٹھ کر گلاب سے کلی نہ کر لوں منہ کا مزہ ٹھیک نہیں ہوتا اور یہ دھنیا ایسی کام چور ہے ابھی تک ادھر نہیں آئی!"

بڑی ٹھکرائن نے شکایت کے لہجہ میں کہا۔ "گلاب کی کلی کو کہتی ہو، یہاں چائے تک نہیں ملی۔ ارے مہراج چائے کب لاؤ گے؟"

اس پر رسوئی کے اندر سے ایک آواز آئی۔ "آیا سرکار!"

اور ٹھکرائیوں نے دیکھا کہ کچن سے مہراج کی بجائے دلیپ مہراج بنا ہوا

چائے کے برتن ٹرے میں رکھے لا رہا ہے۔ اسے دیکھتے ہی سب ٹھکرائنیں ہکا بکا رہ گئیں۔ پھر فوراً ہی اپنے اپنے تخت پر سنبھل کر بیٹھ گئیں اور بڑی ٹھکرائن نے پوچھا۔ "تم دلیپ یہاں کیا کر رہے ہو کچن میں؟ مہراج کہاں مر گیا؟"

"اپنی زمین لینے گیا ہے۔" دلیپ چائے رکھتے ہوئے بولا۔

"اور منیا، دھنیا، جمنا، جوہی؟"

"وہ بھی وہیں گئیں ہیں سرکار بے زمین کسانوں کو آپ کے کھیت دے رہی ہے۔"

"توجے ان نگوڑیوں کے دیدے میں آگ لگے۔" لکشمی غصے سے جھلس کر بولی۔ "ہم کب سے بڑے چائے کے ایک گھونٹ کے لئے ترس رہے ہیں۔ اور یہ کام چور بنیاں مٹر گشت کر رہی ہیں۔"

"مٹر گشت نہیں کر رہی ہیں!" دلیپ بولا۔ "اپنی زندگی کی چال بدل رہی ہیں۔ اور ان کی چال کے ساتھ آپ کو بھی اپنی چال بدلنا ہوگی۔"

"یہ تو کیا چال ہم سے چل رہا ہے؟" بڑی ٹھکرائن بولی۔ "صاف صاف بول!"

"صرف اتنا کہتا ہوں تائی جی۔ اگر گھر میں نوکر نہ ہوں تو گھر کی عورتوں کو بھی تھوڑا بہت کام کر لینا چاہیے۔"

"مگر گھر میں نوکر کیوں نہ ہوں؟" بڑی ٹھکرائن حیرت سے بولیں۔

"ممکن ہے دو چار نوکر کسی نہ کسی طرح رہ جائیں۔ مگر نوکروں کی یہ فوج کی فوج تو ہم نہیں رکھ سکتے۔"

"کیوں نہیں رکھ سکتے۔؟" چاچا چین سنگھ کی بیوی بولیں۔

"اس لئے کہ ہم پہلے نوکروں کو تنخواہ نہیں دیتے تھے۔ بیگار پر کسانوں کے درجنوں چھوکرے اور عورتیں آپ کے ہاں کام کرتی تھیں۔ اب زمینداری گئی تو

بیگار بھی گئی۔ اب جو نوکر رکھو گی تنخواہ دو گی!"

"لو اور سنو۔ بھلا زمیندار نے اپنے نوکروں کو تنخواہ دی ہے؟ ہمارے مائیکے میں تو سات پشتوں سے کسان محض روٹی کپڑے پر گھر کا کام مفت کرتے آئے ہیں۔"

"وہ زمانہ لد گیا۔" دلیپ بولا "اب یا تو نوکروں کو باقاعدہ تنخواہ دو، ورنہ خود کام کرو!"

بڑی ٹھکرائین نخوت سے بولیں۔ "خود کام کرو؟ تمہاری مت تو نہیں ماری ہے؟ ہم زمینداروں کی رانیاں ہیں۔ آج تک، ہم نے کبھی اپنے ہاتھ سے ایک گلاس تک نہیں دھویا ہے۔ ہم کو زیادہ تنگ کرو گے تو ہم اپنے مائیکے چلی جائیں گی۔"

"تمہارے مائیکے میں بھی یہی حال ہوگا۔ زمینداری وہاں بھی ختم ہو چکی ہے۔ اب یہ اللّے تللّے وہاں بھی نہ ہوں گے تائی جی۔ صاف کہے دیتا ہوں۔ آج صبح مہراج مجھ سے کہہ گیا ہے کہ اسے زمین مل گئی ہے۔ آج سے وہ کام پر نہیں آئے گا۔" اتنا کہہ کر دلیپ وہاں سے رخصت ہو گیا۔

دیر تک ٹھکرائنوں پر سکتہ طاری رہا۔ دیر تک وہ حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکتی رہیں۔ ایک دوسرے سے پوچھتی تھی۔ "کیا تجھے کھانا بنانا آتا ہے!" وہ سر ہلا کر کہتی۔ "نہیں!" سب سے آخر میں لکشمی نے بڑے فخریہ انداز میں کہا۔ "بھئی آملیٹ تو ہم بنا لیتے ہیں۔ ایک دفعہ پک نک پہ ہم نے بنایا تھا۔"

دیوان خانے میں بڑے ٹھاکر سر جھکائے ہولے ہولے حقہ پی رہے تھے۔

اور ان کے ارد گرد گھر کے دوسرے ٹھاکر پریشان حال سوگوار بیٹھے تھے ۔ یہ سب لوگ بڑے ٹھاکر جی سے ہفتے کا جیب خرچ لینے کے لئے آئے تھے ۔ اور بڑے ٹھاکر ہولے ہولے حقّہ پیتے ہوئے کہہ رہے تھے ۔

"اس کم بخت گورنمنٹ نے ہم زمینداروں کو کہیں کا نہ رکھا ۔ ایک دن میں لکھ پتی بنا دیا ۔ کنگلا کر کے چھوڑ دیا ۔"

دلیپ بولا ۔ " تاؤ جی ۔ آپ بلا وجہ گورنمنٹ کو کوستے ہیں ۔ آپ سے فالتو زمین لے کر . . . ۔ سرکار نے اب بھی آپ کے پاس تین چار سو ایکڑ زمین رہنے دی ہے ۔ اور یہ زمین اتنی کافی ہے کہ اگر ہم سب خاندان والے مل کر اکٹھے ہو کر اس کا ایک فارم بنا لیں اور مل کر اس پر محنت کریں تو یہ زمین ہمارے خاندان کے خرچ اللو تللو سمیت پورا کر سکتی ہے ۔"

بڑے ٹھاکر نے غصّے سے کہا ۔ " تو تو لمبی بات کرتا ہے ۔ آج کی بات کر ۔ یہ بتا اب آج گھر کا خرچ کیسے چلے گا ؟"

دلیپ نے کہا ۔ " بڑی آسانی سے چل سکتا ہے ۔ مگر اس کے لئے اپنی فضول خرچیوں کو بند کر دینا پڑے گا ۔ ہمارے گودام میں فصل کا گنا بھرا پڑا ہے ۔ اسے چھکڑوں پر لاد کر شوگر فیکٹری میں لے جا کے بیچ دوں گا ۔ تو گھر چلانے کے لئے کافی رقم مل جائے گی ۔"

" تو چھکڑے لدوا کر آج ہی شوگر مل میں لے جاؤ ۔ کھڑے کھڑے میرا منہ کیا دیکھتے ہو ۔"

بڑے ٹھاکر کے چہرے پر رونق آ گئی ۔ انہوں نے پلٹ کر کرپا شاہ کو جو آتے ہوئے دیکھا تو لہک کر بولے ۔ " آؤ ۔ آؤ مہاجن ۔ آج ذرا باہر کھلے میں شطرنج کی ایک بازی ہو جائے !"

"بہت اچھا سرکار!" مہاجن شطرنج کے سمیٹتے ہوئے بولا۔ اور بڑے ٹھاکر کے پیچھے پیچھے دیوان خانے سے باہر نکل گیا۔

بڑے ٹھاکر کے جانے کے بعد دلیپ نے دوسرے ٹھاکروں پر نظر ڈالی۔ اور مصوّر سے بولا۔ "میرے ساتھ چھکڑے لدوا کے شوگر مل چلو گے؟"

مصوّر نے پوچھا۔ "وہاں شراب ملے گی؟"

دلیپ بولا۔ "شوگر فیکٹری میں شراب نہیں ملتی گنے کا رس ملتا ہے۔"

"تو مجھے فرصت نہیں ہے۔" مصوّر انکار میں سر ہلا کر بولا۔

"تم شاعر چاچا! تم چلو گے؟" دلیپ پلٹ کر شاعر چاچا سے مخاطب ہوا۔

"شاعر کی کلپنا آسمان پر اڑتی ہے۔ زمین پر اتر کر چھکڑے نہیں چلا سکتی!"

"بالکل ٹھیک کہتے ہو۔" دلیپ نے سر ہلا کے کہا اور پھر جرنیل چاچا سے پوچھنے لگا۔ جرنیل چاچا بولے۔ "بیٹا۔ میں تمہارے ساتھ ضرور چلتا۔ مگر کیا کروں، میرا رستم ہند آج بیمار ہے۔" وہ اپنی بغل میں دبائے ہوئے مرغ کو دکھا کے بولے "کل رات سے اس نے کچھ نہیں کھایا۔ میں اسے وید کے پاس دکھانے جا رہا ہوں۔"

چڑی مار چاچا جلدی سے اپنے پنجرے کو سنبھالتے ہوئے بولے۔ "چلو میں بھی چلتا ہوں۔ میرے ہیرامن کی صحت بھی ٹھیک نہیں ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ دونوں جلدی سے باہر نکل گئے۔ تو دلیپ پرتھوی راج کی طرف مخاطب ہوا۔ ابھی وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ پرتھوی راج جلدی سے بولا۔ "اماں خوب یاد آیا۔ آج تو پٹواری کے بڑے صاحبزادے سے مقابلہ ہے۔ پتنگ بازی کا۔ میرا اکتارا اور اس کا مجھولا لڑے گا۔ وہ گھمسان کا رن پڑے گا کہ دور، دور سے لوگ دیکھنے آویں گے۔ تم بھی ضرور آنا۔ میں چلتا ہوں، میرا مانجھا ابھی تک گیلا ہے اور مجھے سکھا کر اس کا پھینٹی کرنا ہے!"

دلیپ نے غصے سے کہا "ضرور کرو پھینٹی۔ ایک دن زندگی تمہاری دھینٹی کرے گی۔ کہ تم بھی یاد کرو گے؟"

دلیپ غصے سے بھرا ہوا دیوان خانے سے باہر نکل گیا۔ اسے اپنے کام چور رشتے داروں کے مزاج کا اندازہ تو تھا لیکن وہ امید کرتا تھا کہ مصیبت سر پر پڑتے ہی وہ کسی حد تک تو ٹھیک ہو جائیں گے۔ مگر یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا تھا۔ اب اس کے سامنے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ گاؤں کے دوسرے کسانوں کی مدد لے۔ اور ان کے چھکڑوں کے ساتھ اپنے چھکڑے بھی لدوا کے شوگر فیکٹری کو جائے۔ اکیلا ہی۔

سب سے پہلے دلیپ نے نہیں بلکہ سندھیا نے دلیپ کو دیکھا۔ دلیپ پالن گڈھ کے دوسروں کسانوں کے ساتھ چھکڑوں میں گنّے لاد کے دھنپت رائے شوگر مل میں گنّے پہنچانے گیا تھا۔ یہ شوگر مل سندھیا کے باپ کی تھی۔ اور اسی مل میں سندھیا نے دیکھا کہ ایک نوجوان جو بڑا خوبصورت تھا۔ لیکن دیکھنے میں بالکل کسان لگتا تھا۔ تلائی کے سیکشن میں بابو سے لڑ جھگڑ رہا تھا۔ لڑتے جھگڑتے جب تلائی کے بابو نے اس نوجوان کسان کو انگریزی میں گالیاں دیں تو وہ نوجوان کسان بھی پلٹ کر نہایت فصیح انگریزی میں اسے جواب دینے لگا اور سندھیا یہ دیکھ کر بھونچکا رہ گئی۔ کہ یہ کسان کیسا ہے جو اس قدر پڑھا لکھا ہو کر غریب کسانوں کے کپڑے پہنے ہوئے ہماری مل میں گنّا بیچنے آیا ہے؟

سندھیا بچپن سے تیرہ برس کی عمر تک مسوری میں پڑھی۔ پھر جب اس

کی ماں مرگئی تو سیٹھ گھنپت رائے نے اسے لندن اور پیرس میں مزید تعلیم کے لئے بھیج دیا۔ جہاں سے وہ سات سال کے بعد چند دن ہوئے لوٹی تھی۔ اس لئے اسے اپنے وطن کا ماحول نیا نیا اور اجنبی لگ رہا تھا۔

سندھیا کو بچپن ہی سے فنون لطیفہ سے بڑی دلچسپی تھی۔ اسے گانے سے شوق تھا۔ مصوری سے شوق تھا اور تھیئٹر آرٹس پہ تو اس کی جان جاتی تھی۔ اس نے تین سال لندن میں رہ کر مغربی موسیقی سیکھی تھی اور چار سال پیرس میں رہ کر مصوری اور تھیئٹر پر عبور حاصل کیا تھا۔ میک اپ کے شعبے میں اور اسٹیج کی روشنیوں کے بندوبست میں اس کی معلومات اور عملی تجربہ بھی بہت وسیع تھے۔ اس کا ارادہ تھا کہ اپنی مل میں ڈرامہ گروپ قائم کرے۔ اس سلسلے میں کئی بار وہ اپنے باپ سے گفتگو کر چکی تھی جو اس قسم کی تجویزوں کا سخت مخالف تھا۔

سندھیا اس وقت جبکہ یہ جھگڑا ہو رہا تھا۔ کسانوں کی نظروں سے اوجھل ایک کاپی ہاتھ میں لئے کسانوں کے خاکے بنا رہی تھی۔ جب جھگڑا زیادہ بڑھ گیا تو وہ دوڑی دوڑی اپنے والد کے دفتر میں گئی اور سیٹھ دھنپت رائے نے اسی وقت ٹیلیفون کر کے تلاتی کے بابو اور اس جھگڑنے والے اور انگریزی بولنے والے کسان کو اپنے دفتر میں طلب کیا۔ جب نڈر اور بے خوف انداز میں دلیپ مل مالک کے دفتر میں گیا تو وہ انداز سندھیا کو بہت اچھا لگا۔ اسے دلیپ کا مضبوط چہرہ اور اونچی گردن اور فراخ ماتھا بھی بہت بھلا لگا۔ اس کی چال میں ایک عجیب اعتماد اور وقار تھا۔ جس نے سندھیا کے دل میں ایک عجب ارتعاش سا پیدا کر دیا۔ اور وہ کھوئی کھوئی سی اپنے کونے میں اپنے خاکے کی کاپی لئے کھڑی رہ گئی اور دلیپ کے سامنے نہ جا سکی۔

پھر اس نے اپنے باپ کے وسیع اور عالیشان دفتر کا پچھلا پرائیوٹ دروازہ

کھول کر اپنے باپ اور دلیپ کی ساری گفتگو بھی سن لی۔ سیٹھ وھنپت رائے بڑے نرم لہجہ میں دلیپ کو سمجھا رہا تھا۔

"میرے خیال میں تلائی کے بابو نے غلطی سے گنّا کم تول دیا ہے!"

"غلطی سے نہیں سیٹھ جی جان بوجھ کر کم تولا گیا ہے۔"

سیٹھ نے کہا، "انسان سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ جھگڑا کرنے سے کیا فائدہ؟"

اتنا کہہ کر سیٹھ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پچاس روپے نکالے اور دلیپ کو دے کر کہنے لگا، "یہ پچاس روپے تم اوپر سے لے جاؤ۔ مگر جھگڑا مت کرو۔"

دلیپ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے غصّے سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا، "میں یہاں گنّا بیچنے آیا ہوں۔ ایمان بیچنے نہیں آیا۔"

یہ سن کر سیٹھ نے بھی فوراً بڑے کڑوے لہجہ میں کہا، "میں بھی یہاں گنّا خریدنے کے لئے بیٹھا ہوں۔ ایمان خریدنے کے لئے نہیں بیٹھا ہوں۔ یہ روپیہ جو میں تمہیں دے رہا ہوں رشوت نہیں ہے۔ گنّے کی قیمت ہے۔"

دلیپ بولا، "صرف مجھی کو زیادہ روپے دینے سے کام نہیں چلے گا سیٹھ جی! سب کسانوں کو جن کا گنّا کم تولا گیا ہے سب کو روپیہ دینا پڑے گا!"

"سب کو ملے گا۔" سیٹھ نے دلیپ کے سامنے ٹیلیفون اٹھا کر تلائی کے سیکشن کے ماسٹر کو تاکید کر دی! اور دلیپ سیٹھ جی کا شکریہ ادا کرنے کے بعد کمرے سے باہر نکل گیا۔

دلیپ کے جانے کے بعد سندھیا اپنے باپ کے پاس آئی اور بولی "پتا جی یہ جھگڑالو کسان کون تھا جو اس گستاخی سے بات کر رہا تھا۔"

سیٹھ بولا، "بیٹی، یہ کوئی کسان نہیں ہے۔ پالن گڑھ کے سب کسانوں کو میں جانتا ہوں۔ بے حد سیدھے اور شریف ہیں۔ جو تول دیا انہوں نے قبول کر لیا

جو دے دیا انہوں نے لے لیا۔ یہ تو حویلی کے ٹھاکروں کا لڑکا ہے۔ جو کچھ دن پہلے پالن گڈھ کے زمیندار تھے۔ اس کا نام دلیپ ہے۔ اور ان کے خاندان میں یہ پہلا لڑکا ہے جس نے کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اس لئے یہ اپنے آپ کو بہت سمجھتا ہے۔ بدقسمتی سے اس نے ایگریکلچرل کالج کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اس لئے یہ اپنے آپ کو کسان بھی سمجھتا ہے اور الٹے سیدھے لوگوں سے الٹی سیدھی باتیں سیکھ لی ہیں۔ اس لئے اس کے دل میں کوآپریٹو فارمنگ کر کے اپنی اور کسانوں کی حالت سدھارنے کا سودا سمایا ہے۔ مجھے سب رپورٹ ملتی رہتی ہے یہ بہت ہی غلط اور خطرناک آدمی ہے۔ مگر زمانہ مار پیٹ کر اس کو خود ٹھیک کر دیگا۔"
سیٹھ یہاں تک کہہ کر رک گئے۔ پھر انہوں نے سندھیا کی کاپی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"خاکوں کی کاپی ہے!" سندھیا نے کہا۔ اور اپنے باپ کو خاکے دکھائے بغیر کاپی جھلاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

آج پالن گڈھ کے کسان بہت خوش تھے۔ دلیپ کی سمجھداری سے آج انہیں مل سے اتنا پیسہ ملا تھا جتنا انہیں آج تک کبھی مل سے دستیاب نہیں ہوا تھا۔ اس لئے آج وہ خوشی خوشی گاتے ہوئے چھکڑے چلاتے ہوئے دلیپ کو دعائیں دیتے ہوئے واپس اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔

پہاڑیوں پر آفتاب غروب ہو رہا تھا اور بادلوں کے کنارے اور نارنجی

تھے اور ہوا دور کی پہاڑیوں سے جنگلی پیڑوں اور پھولوں کی اجنبی خوشبوؤں سے لدی ہوئی تھی۔ اور اس حسین پسِ منظر میں گاتے ہوئے محنتی کسانوں کے ریس کرتے ہوئے چھکڑے بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔

سندھیا کی موٹر سڑک پر ایک گڈھے میں پھنسی ہوئی تھی۔ وہ غروبِ آفتاب کے نظارے کی تصویر بنانے کے لئے مل سے بہت دور نکل گئی تھی۔ کہ واپسی پر اس کی موٹر ایک گڈھے میں پھنس گئی۔ اس وقت مل کی طرف سے آنے والے کسانوں کے چھکڑے جو ایک دوسرے سے ریس کرتے ہوئے جارہے تھے۔ گرد و غبار بکھیرتے ہوئے اس کے سامنے سے گذرتے گئے۔ وہ لوگ اس قدر خوش تھے اور گاتے ہوئے اور اپنے چھکڑوں کی ریس میں مشغول تھے کہ انہیں رک کر سندھیا کی مدد کرنے کا خیال تک نہ آیا۔ درجنوں چھکڑے اس کے سامنے سے بھاگتے ہوئے گذر گئے۔ پھر سب سے آخر کا چھکڑا اکھی تیزی سے دوڑتا ہوا اس کے سامنے سے گذر گیا۔

آگے جاکر وہ چھکڑا رکا اور اس میں سے دلیپ نکلا۔ اور مڑکر پیدل چلتا ہوا واپس گاڑی کے پاس آیا اور سندھیا کا مٹی میں دھول میں اٹا ہوا چہرہ دیکھ کر بہت ہنسا اور بولا۔

"میک اپ اچھا ہے!"

"شٹ اپ۔" سندھیا نے غصّے سے کہا اور ساڑھی کے پلّو سے اپنے چہرے کو بار بار صاف کرنے لگی۔

"بہت خوب! اچھا تو میں چلتا ہوں۔" کہہ کر دلیپ واپس جانے لگا۔ تو شام کے بڑھتے ہوئے سایوں کو دیکھ کر سندھیا نے بے چینی سے کہا۔

"اے مسٹر۔"

"میرا نام دلیپ ہے۔" دلیپ نے رک کر کہا۔

"جو کچھ بھی ہے۔" سندھیا نرم لہجہ میں بولنے کی کوشش کرتے ہوئے کسی قدر تلخی اور تحکم سے کہہ گئی۔ "ذرا میری یہ گاڑی گڈھے سے نکال دو!"

دلیپ نے اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر شوخ نگاہوں سے سندھیا کو تاکتے ہوئے بولا۔ "گاڑی تمہاری، گڈھا سڑک کا۔ میں مفت میں کسی کا کام کیوں کروں؟"

سندھیا بولی۔ "میں تمہیں دس روپے دوں گی۔"

"اچھا۔" دلیپ بولا۔ "مگر تمہیں بھی میرے ساتھ مل کے زور لگانا ہوگا۔"

سندھیا گاڑی سے اتر آئی اور دلیپ کے ساتھ مل کر زور لگانے لگی۔ گاڑی گڈھے سے نکل آئی مگر پنکچر ہو چکی تھی۔ دلیپ نے اشارہ کر کے کہا۔

"یہ وہیل تو پنکچر ہے!"

"میرے پاس سٹپنی ہے!" سندھیا بولی۔

"لاؤ تو میں اسے فٹ کئے دیتا ہوں۔"

"تم نے موٹر کا کام کہاں سیکھا ہے؟" سندھیا نے پوچھا۔

"شہر سے۔"

"شہر کیا کرنے گئے تھے؟"

"پڑھنے گیا تھا۔"

"کیا پڑھا؟"

"تمہارا سر!" دلیپ جل کر بولا۔ "سب کچھ مجھی سے پوچھے جاتی ہو۔ اپنا نام تک نہیں بتاتی ہو۔"

"میرا نام سندھیا ہے۔" وہ بولی۔ "یہ دھن پت رائے شوگر مل میرے

باپ کی ہے۔"

"اوہ!" دلیپ نے رک کر کہا۔ "مگر اس سے پہلے میں نے تمہیں وہاں نہیں دیکھا۔"

"میں یہاں نہیں تھی۔ میری ماتاجی کے دیہانت کے بعد مجھے پتاجی نے لندن بھیج دیا تھا پڑھنے کے لئے۔"

"وہاں کتنے سال رہیں؟"

"سات سال تین سال لندن میں اور چار سال پیرس میں!"

"ان سات سالوں میں کیا سیکھا؟"

"تمہارا سر!" سندھیا بولی۔ "مجھ سے باتیں کئے جاتے ہو سیٹی لگاتے نہیں ہو!"

"لگا تو رہا ہوں باتیں بھی کرتا جاتا ہوں۔ تمہارا کیا بگڑتا ہے؟" دلیپ سیٹی چڑھاتے ہوئے بولا۔ "ادھر شام کو کیا کرنے آئی تھیں؟"

"غروب آفتاب کی تصویر بنانے آئی تھی۔"

"بنا لی؟"

"ہوں ہاں"

"دکھاؤ!"

"پہلے تم سیٹی تو لگاؤ۔"

"لگا دی۔ دیکھ لو ٹھیک ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔"

"تو اب تصویر دکھاؤ۔"

"موٹر میں پڑی ہے۔" سندھیا موٹر کے پٹ کھول کر اسے اندر آنے کی

دعوت دیتے ہوئے بولی۔" اندر آکر دیکھو۔"

دلیپ سندھیا کے ساتھ اندر آگیا۔ اور چند لمحوں تک تصویر کو غور سے دیکھتا رہا۔ سندھیا بولی "میں نے یہ تصویر یہاں موٹر کی کھڑکی میں بیٹھ کر بنائی ہے ہے نا خوب صورت ؟"

دلیپ نے تصویر کو غور سے دیکھا۔ پھر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔ اور آہستہ سے کہنے لگا۔" ہاں موٹر کی کھڑکی میں بیٹھ کر واقعی دنیا خوب صورت دکھائی دیتی ہے۔"

اس کے لہجہ کی گہری تلخی سے سندھیا چونک گئی۔ دلیپ کا سوچ میں ڈوبا ہوا چہرہ دیکھ کر بولی۔

"تم امیر لوگوں سے نفرت کیوں کرتے ہو ؟"

دلیپ نے کہا۔" جب ایک لاکھ آدمی غریب ہو جاتے ہیں۔ جب ایک آدمی لکھ پتی بنتا ہے۔"

"سبھی لکھ پتی برے نہیں ہوتے۔ مجھے دیکھو۔ میں بھی لکھ پتی ہوں۔ کیا تمہیں بری دکھائی دیتی ہوں ؟"

دلیپ نے غور سے سندھیا کے شگفتہ بہار آفریں حسن کو دیکھا پھر آہستہ سے سر ہلا کر بولا۔" کسان اپنا خون دے کر زمین سے گنے کا رس نکالتے ہیں۔ وہ رس تمہارے کارخانے میں شکر کی صورت میں ڈھل جاتا ہے۔ اس کا منافع تمہاری رگوں میں اترتا ہے۔ منافع غور کرو۔ تو کیا ہے ؟ کسان کا تازہ خون ہے۔ جو تمہاری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ یہ بھی ایک طرح کا TRANS FUSION OF BLOOD ہے۔ جو ہر روز تمہیں دیا جا رہا ہے۔ پر . . . . ."

"اوہ ! تم کیسی خوفناک باتیں کرتے ہو ؟" سندھیا نے جھلا کر کہا۔

"تم نے پوچھا تو میں نے بتایا۔ ورنہ مجھے بات کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟"

"اوہ۔ اوہ تم بہت برے آدمی ہو۔ اتر جاؤ میری گاڑی سے !"

دلیپ مسکرا کر گاڑی کا پٹ کھول کر اتر گیا۔ سڑک پر کھڑے ہو کر اس نے تضحیک آمیز انداز میں سندھیا کو گڈ بائی کہا اور پلٹ کر اپنے چھکڑے پر سوار ہو کر چلا گیا۔ سندھیا دیر تک اپنی گاڑی میں بیٹھی مڑ کر اس چھکڑے کو سڑک پر جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

جب چھکڑا موڑ پر غائب ہو گیا تو اس نے انجن کھولا۔

❖

ٹھاکر بلرام سنگھ ایک ماڈرن آدمی تھا۔ آج کل کے زمانے میں ایک ماڈرن آدمی کو کامیاں ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے بلرام سنگھ کامیاں تھا۔ آج کل کے زمانے میں ایک ماڈرن آدمی کو جھوٹا۔ فریبی۔ چالباز ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے بلرام سنگھ جھوٹا۔ فریبی اور چالباز بھی تھا۔ آج کل کے ماڈرن آدمی کی گفتگو دلچسپ بھی ہونی چاہیئے۔ بلرام سنگھ کی گفتگو کا انداز بے حد دلچسپ اور دلکش تھا۔ آج کل کے ماڈرن آدمی کا بنگلہ عمدہ۔ کار نئی اور لڑکی کار سے بھی نئی ہونی چاہیئے۔ اس کے لئے بلرام سنگھ کے پاس یہ سب کچھ تھا۔ اس لئے خوب سے خوب تر کی تلاش میں یہ لوگ بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ کہ ماڈرن زمانے کا یہی چلن ہے۔ یہ سب لوگ شریف عیار تھے رنگین چلن اوباش تھے۔ پاکباز جیب کترے تھے۔ جس معصومیت سے یہ لوگ ایک دوسرے کی جیب کاٹتے تھے اس پر کسی قانون کی کوئی گرفت نہیں ہو سکتی تھی۔

آج کل کے کسی ماڈرن بزنس مین کو دیکھ لو، بالکل ایک سا ملے گا۔ اسے آگے پیچھے اوپر نیچے سے چھان پھٹک کر دیکھ لو بالکل ایک سا ملے گا۔ اس کی روح

اور دل و دماغ کا ہر خانہ کھول کے دیکھ لو بالکل ایک سی خواہشات ملیں گی۔ سرمایہ داروں کی خرادپر ڈھلے ہوئے انسان میں ایسی حیرت انگیز یکسانیت پائی جاتی ہے کہ ان پر انسان نہیں مشین کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اگر آپ اس مشین کے بٹنوں سے واقف ہیں تو آپ کو اچھی طرح یہ بھی معلوم ہوگا کہ کس بٹن کے دبانے سے آپ کو وہسکی مل سکتی ہے۔ کس بٹن کے دبانے سے آپ کو لڑکی پیش کر دی جائے گی۔ کس بٹن کے دبانے سے آپ کو ٹھیکے میں سے کمیشن ملے گا۔ کس میں پارٹنرشپ۔ کس بٹن کے دبانے سے کتنے انچ کی مسکراہٹ ملتی ہے، اور کس بٹن کے دبانے سے آپ دفتر سے باہر بھی نکالے جا سکتے ہیں۔ ہر ردِّ عمل اس قدر یکساں، واضح اور بنا تلا ملتا ہے کہ کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ ان مہذب مشینوں سے دور کہیں جانوروں میں چل کر رہیے۔ سنا ہے کہ بدی بڑی دل کش ہوتی ہے۔ لیکن سرمایہ داری کی بدی میں تو اب کوئی دل کشی بھی نہیں رہی۔ اس قدر بوریت بھری یکسانیت اس میں پیدا ہو چکی ہے۔ سبھی ایک سی شراب پیتے ہیں۔ ایک سی کار رکھتے ہیں۔ ایک سے پھُسّے کی داستانیں۔ ان سب کے بچّے ایک سے طرح کے سکول میں جاتے ہیں۔ ایک طرح کے لباس پہنتے ہیں۔ ایک طرح کی گفتگو کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی بیویاں ایک ہی طرح کی ہوتی ہیں۔ ان کے مشاغل، گھر گھر کی سجاوٹ تک ایک طرح کی ہوتی ہے۔ اور یہ سب لوگ سرمائے داری کے دائرے میں گھومتے ہوئے جیسے کتّا اپنی دُم کے پیچھے گھومتا ہے۔ مقابلے کی وردی پہنے، منافع کی رائفل لٹکائے ایک دوسرے کے پیچھے گھومتے ہوئے لیفٹ رائٹ، لیفٹ رائٹ کرتے ہوئے کس قدر احمق اور نامعقول معلوم ہوتے ہیں۔

ہاں مگر سب کو نہیں معلوم ہوتے اور خود کو تو بالکل معلوم نہیں ہوتے۔ ان کو اپنی کسی بات میں عجب، حُمق یا چھچھورپن کا احساس نہیں ہوتا۔ اپنے وجود سے مطمئن ہونا ہر زندہ شے کا خاصہ ہے۔ بلرام سنگھ بھی اپنے آپ سے بہت مطمئن تھا۔ اپنے

وجود سے، اپنے حالات سے، اپنی زندگی سے بے حد خوش ہیں۔ اس لئے پہلے پہل جب دھنپت رائے نے اپنی اکلوتی لڑکی کی شادی کسی دوسری جگہ لگانی چاہی تو اسے بالکل برا محسوس نہ ہوا۔

مگر جب زمینداری چلی گئی تو اسے اپنے پاؤں سے زمین کھسکتی معلوم ہوئی حالانکہ وہ شوگر مل کا جنرل منیجر تھا۔ اور اس کے پاس اتنا روپیہ بھی تھا پھر بھی اب اسے کسی سہارے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ کسی مستحکم سہارے کی۔ شادی کے بارے میں اس نے سنجیدگی سے کبھی سوچا نہ تھا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ شادی تو صرف ان احمقوں کو راس آتی ہے جن کی آمدنی محدود ہوتی ہے اور اس لئے وہ اپنی جنسی گذر بسر کے لئے ایک عورت پر قناعت کرنے پر مجبور ہیں۔ اور اس دنیا میں چونکہ کثیر تعداد آبادی کی آمدنی کے وسائل بے حد محدود ہیں۔ اور غضب یہ کہ عورتوں کی تعداد بھی محدود ہے۔ اس لئے شادی کو ایک بے حد دلکش مذہبی رنگ دے گیا ہے۔ لیکن بلرام سنگھ کو نہ کبھی پیسے کی کمی رہی۔ نہ عورتوں کی۔ اس لئے اس کے ذہن میں شادی کی کوئی اہمیت نہیں رہی لیکن زمینداری ختم ہو جانے کے بعد اس نے سوچا کہ اگر سندھیا سے شادی ہو جائے تو یہ شادی ایک مستحکم سہارا ثابت ہو سکتی ہے۔ اس لئے اس نے سندھیا کو نئی نظروں سے دیکھنا شروع کیا۔ جیسے وہ صرف ایک عورت ہی نہ ہو۔ ایک کارخانہ بھی ہو۔ بینک بیلنس بھی ہو اور فکسڈ ڈپازٹ بھی۔ اب سندھیا کو حاصل کرنا اس کے لئے بیحد ضروری ہو گیا۔ ادھر اُدھر کی عورتیں تو آتی جاتی اور ملتی رہیں گی۔ لیکن سندھیا سے شادی بیحد ضروری تھی۔ اور اپنی سب مشکلات کا آسان ترین علاج۔ اور بلرام سنگھ آہنی ارادے کا آدمی تھا جب اس کے ذہن میں ایک بات گھس جاتی تو وہ ہر ممکن طریقے سے اسے پورا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اور کوئی طریقہ اور کوئی وسیلہ اس کے لئے ناجائز نہیں تھا۔ زندگی کی تگ و دو اس کے لئے غیر اخلاقی تھی۔ وہ نہ اخلاقی تھی نہ بد اخلاقی۔ بلکہ محض بے ضمیر اور غیر اخلاقی

جیسے سیب ہوتا ہے یا سنگترہ!

وہ ابھی کسی جذبے کو بھی استعمال کرتا تو سوچ سمجھ کر ٹھنڈے دل سے حساب کتاب کر کے ! ساڑھے چار فی صدی سود نکال کے۔ آخر وہ جذبہ ہی کیا جس سے کسی طرح کا نفع نہ کمایا جا سکے! اب یہ جذبہ چاہے محبت ہو یا نفرت، غصہ ہو یا درگذر ہو، حب الوطنی ہو یا وطن دشمنی، ان سب سے ساڑھے چار فی صدی تو نکلنا ہی چاہیئے۔ ورنہ ایسے جذبے کو جھاڑو دے کر زندگی سے باہر نکال دینا چاہیئے۔

اس لیئے اس نے بدلے ہوئے حالات میں سوچ سمجھ کر ایک نیا پلان بنایا۔ سب سے پہلے اس نے شوگر مل کی ایکسٹینشن کے لیئے سیٹھ دھن پت رائے کو تیار کیا۔ یہ بتا کر اب کہ جب زمین کسانوں کے ہاتھ میں چلی جائے گی تو لازماً کسان اپنی زمینوں پر زیادہ محنت کریں گے۔ اس لیئے گنّے کی فصل زیادہ ہوگی۔ اس لیئے مل کی ایکسٹینشن سے زیادہ مال تیار ہو سکے گا۔ مل کی ایکسٹینشن کے سلسلے میں کئی ضمنی فوائد بھی اس کی نظر میں تھے۔ اس کے ہاتھ میں زیادہ فنڈ آئے گا اور پھر عمارت کا ٹھیکہ بھی کسی ٹھیکیدار کو دیا جائے گا۔ اور نئی مشینری بھی کہیں نہ کہیں سے آئے گی۔ انہی ساڑھے چار فیصدی کو دگنا بلکہ تگنا کرنے کی کئی گنجائش نکل سکتی ہیں۔ آدمی اگر سمجھ دار ہو تو کیا نہیں کر سکتا پھر زیادہ کام بڑھانے سے اس کے ہاتھ میں زیادہ طاقت آئے گی۔ زیادہ پیداوار سے سیٹھ بھی زیادہ خوش ہوں گے اور اس زیادہ خوشی میں سے وہ بھی اپنا حصّہ بٹائے گا بظاہر صرف ساڑھے چار فی صدی یعنی ایک معقول لڑکے کی ایک معقول لڑکی سے شادی۔ مگر دراصل صرف ساڑھے فی صدی نہیں بلکہ سیٹھ کا کل اصل مع سود غائب! سمجھ دار انسان کو اپنی خوشی کا ایک پلان بنانا پڑتا ہے ورنہ بلرام سنگھ اور اس انسان میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔ جو راہ چلتے غروب آفتاب کے حسین نظارے کو دیکھ کر ہی خوش ہو لیتا ہے؟

بلرام سنگھ لمبے لمبے مضبوط ڈگ بھرتا ہوا سیٹھ دھنپت رائے کے آفس میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر مسرّت کی چمک تھی۔

"مل کی ایکسٹینشن کی منظوری تو مل گئی ہے۔" اس نے بتایا۔ "لیکن کھدائی کا کام شروع کرانے کے لئے پھر شہر جانا پڑے گا!"

"کیوں؟" سیٹھ نے پوچھا۔

"مل کے آس پاس جو زمین میں بڑے بڑے ناہموار ٹیلے ہیں انہیں برابر کرنے کے لئے DYNAMITE چاہیئے۔ اس کے لئے بھی منظوری لینا پڑے گی!"

"تمہیں اتنا جھنجھٹ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" سیٹھ نے کہا۔ "کسی اچھے ٹھیکے دار کو ٹھیکے پر کام دے دو۔ وہ خود کرتا پھرے گا۔ مگر ایکسپرٹ ہونا چاہیئے!"

"اچھا تو ایسا ہی کرلیں گے۔" بلرام سنگھ نے گویا سیٹھ کی تجویز پر صاد کیا۔ حالانکہ وہ پہلے ہی یہ سب سوچے بیٹھا تھا۔ بلکہ ایک ٹھیکیدار سے بھی طے کئے بیٹھا تھا۔ بلکہ ایڈوانس میں کمیشن کا ایک حصّہ لے کر کھا چکا تھا!

بلرام سنگھ نے خاموشی سے ایک فائل آگے بڑھا دی اور کہا۔ "یہ چند ضروری کاغذات ہیں۔ ان پر دستخط کر دیجئے!"

"یہ کیا ہیں؟" سیٹھ نے پوچھا۔

"پالن گڈھ کے ٹھاکروں کی حویلی کے قرقی کے کاغذ ہیں۔"

"قرقی کی کیا ضرورت پڑ گئی؟"

"بیس ہزار روپیہ ہمارا ان کے ذمّہ نکلتا ہے۔ حویلی ہمارے نام گردی ہے۔ گذشتہ چھ سالوں میں ٹھاکروں نے اصل تو کیا سود کا بھی ایک پیسہ واپس نہیں کیا ہے۔"

"نہیں کیا تو اب کردیں گے۔" سیٹھ دھنپت رائے نے نرمی سے کہا۔ کیونکہ اس کے سنگرہا خاندان کے ٹھاکروں سے پرانے تعلقات تھے۔ "تم ان سے مل کر بات

کر لو!"

"وہ اب کہاں سے دیں گے؟" بلرام سنگھ نے تضحیک آمیز لہجہ میں کہا۔ زمینداری ختم ہو گئی ۔ ایک حویلی باقی رہ گئی ہے۔ اگر آپ اسے قرق نہیں کرائیں گے تو اسے بھی بیچ باچ کے کھا جائیں گے اور ہمارا قرضہ ویسے کا ویسا پڑا رہ جائے گا۔ اب مزید ڈھیل دینا غلط ہوگا!" بلرام سنگھ نے کاغذ آگے بڑھا دیئے! سیٹھ نے دستخط کر دیئے! سیٹھ دھنپت رائے کو بلرام سنگھ کا ٹھیٹھ تجارتی انداز فکر بہت پسند تھا۔ ہر قسم کے جذبے سے عاری ۔ دو اور دو چار کر کے سوچنے والا مضبوط دماغ ہی مل کو چلا سکتا ہے!

حویلی کے بڑے پھاٹک پر قرقی کا نوٹس لگ گیا تو ٹھاکر لوگ پھاٹک پر جمع ہو کر واویلا کرنے لگے ۔ دلیپ نے اپنے خاندان کے افراد کو کبھی اس قدر برافروختہ نہیں دیکھا تھا۔ بڑے ٹھاکر بار بار اپنی مونچھوں کو بل دے کر کہتے تھے۔ "وہ اب مل مالک کی یہ ہمت ؟ ہماری حویلی قرق کرائے گا ؟ ہماری زمین کے گنے سے تو اس کی مل چل رہی ہے ۔ احسان فراموش!"

جرنیل چاچا گرج کر بولے ۔" اجی آنے دو اسے قرقی کرنے کے لئے ۔ میرا رستم ہند (بغل سے مرغ نکال کر) اس کے وہ لتے لے گا کہ چونچ مار مار کر میدان سے بھگا دے گا ۔ قرقی ورقی دھری رہ جائے گی سالے کی!"

دلیپ نے ہنس کر کہا۔ "تاؤ جی ۔ اگر آدمی کے بجائے مرغ لڑ سکتے تو ہندوستان کی پانی پت کی تیسری لڑائی میں ہم نہ ہارتے! اگر اب آپ کے مرغوں کی پلٹن اس حویلی کی حفاظت نہیں کر سکے گی ۔ اس کے لئے ہم سب کو مل کر اپنی زمینوں پر کام کرنا ہوگا ۔ اب بھی سب مل ملا کے ہماری تین سو ایکڑ سے زیادہ ہی زمین ہوگی جو سرکار نے ہماری کاشت اور گذارے کے لئے ہمارے پاس چھوڑ دی ہے ۔ اگر ہم سب لوگ

اپنی آرام طلبی چھوڑ دیں اور مل جل کے کھیتی باڑی کریں تو مل مالک کا قرضہ اب بھی چکایا جا سکتا ہے۔ سیٹھ دھنپت رائے کے مزاج کو میں جانتا ہوں۔ اگر ہم اسے اپنی فصل کا آدھا گنا بھی اپنے قرضے میں دیدیں گے تو وہ مان جائے گا!"

پرتھوی راج چلا کر بولا۔ "وہ تو مان جائے گا۔ بنیا جو ٹھہرا۔ مگر ہم سب نہیں مانیں گے تمہاری بات! ہم ٹھاکر لوگ ہیں۔ کبھی ٹھاکروں نے بھی ہل چلائے ہیں؟ یہ تو کولیوں، پالیوں اور ایسے ہی نیچ لوگوں کا کام ہے!"

دلیپ کی مٹھیاں کس گئیں۔ مگر وہ اپنے غصّے کی لہر کو دباتا ہوا بولا۔ "نیچ وہ ہے جو کام نہیں کرتا ہے۔ جو دھرتی سے ان اگاتا ہے وہ کبھی نیچ نہیں ہو سکتا!"

"کچھ بھی کہو۔" جرنیل چاچا اپنے رستم ہند کے پروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ "ہم سنگرہا خاندان کے ٹھاکر لوگ بڑی آن اور مریادا والے ہیں۔ ہماری سات پشتوں میں کسی نے آج تک ہل کو ہات نہیں لگایا۔ ہم کیوں لگائیں؟"

دلیپ بولا۔ "وہ تو ہمارے بزرگوں نے کبھی مل میں گنا بھی نہیں بیچا تھا پھر ہم کیوں بیچتے ہیں؟"

"یہ بیکار کی حجت ہے۔" جرنیل چاچا خفا ہو کر بولے اور اپنا مرغ اپنی بغل میں داب کر سرک گئے۔

ان کے جاتے ہی خاندان کے دوسرے ٹھاکر بھی ایک ایک کر کے کھسکنے لگے آخر میں صرف دلیپ ہی اس نوٹس کو پڑھتا رہ گیا جس میں صاف طور پر یہ درج تھا کہ اگر ایک ماہ کے اندر پیسہ واپس نہ کیا گیا تو حویلی قرق کر دی جائے گی۔"

بیزار ہو کر دلیپ وہاں سے پلٹنے ہی والا تھا کہ اس نے دیکھا کہ ایک سرخ چہرہ، بے حد سرخ چہرہ اس کے بالکل قریب اور نوٹس کے بے حد قریب جا کر غور سے پڑھ رہا ہے۔ یہ گجیندر سنگھ کا چہرہ تھا اور اس کے منہ سے شراب کی

شراب کی تیز بو آئی تھی۔ دلیپ آہستہ سے پیچھے ہٹا تو گجیندر سنگھ نوٹس پڑھ کے زور سے ہنسا۔

دلیپ نے پوچھا۔ "کیوں ہنستے ہو؟"

"یہ حویلی قرق نہیں ہو سکتی۔" گجیندر سنگھ بڑے اطمینان سے بولا۔ پھر اس نے اپنے بائیں بازو میں پکڑی ہوئی بوتل کو اونچا کیا اور اپنے منہ سے لگا کر اور ایک بڑا سا گھونٹ لے کر بولا۔ "کبھی قرق نہیں ہو سکتی!"

"کیوں نہیں ہو سکتی؟"

شرابی مصور نے نوٹس پر ہاتھ مارا اور بولا۔ "اس نوٹس کی انگریزی غلط ہے اس لئے یہ نوٹس بھی غلط ہے! اس لئے اس حویلی کی قرقی بھی غلط ہے!"

گجیندر سنگھ نے بوتل کو منہ سے لگا کے پھر ایک گھونٹ بھرا اور بڑے اطمینان سے مسکراتا ہوا حویلی کے اندر واپس چلا گیا!

دلیپ بھی کچھ سوچ کر پلٹا اور بڑے دیوان خانے میں جا کر بڑے ٹھاکر جی سے کہنے لگا کہ "اگر دیوان خانے کا فرنیچر بیچ ڈالا جائے تو دو تین ہزار روپے میں اٹھ جائے گا۔ فانوس بھی دو تین ہزار روپے میں اٹھ جائے گا۔ اور پرانے ایرانی غالیچے بھی آٹھ دس ہزار میں بک جائیں گے۔" پھر یہ کہتے کہتے اس کی نظر خاندان کے بزرگوں کی ان بڑی بڑی تصویروں پر گئی جن کے گرد چاندی کے فریم لگے ہوئے تھے۔

وہ آہستہ سے بولا۔ "پھر یہ چاندی کے فریم بھی کافی قیمتی ہوں گے!"

"بس بس۔ گستاخ۔" بڑے ٹھاکر حقہ چھوڑ کر گرجے۔ "اپنی زبان بند کر لے بزرگوں کی عزت پر ہاتھ ڈالتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی؟"

"بزرگوں کی عزت ان چاندی کے فریموں سے نہیں ہے تایا جی۔ اگر آپ نے یہ چیزیں بیچ کے قرضہ چکا کے یہ حویلی بچا لی تو انہی بزرگوں کی آتما آپ کو ہر

گھڑی دعا دے گی!"

"نکل جا دیوان خانے سے، دور ہو جا میری نظروں سے۔" بڑے ٹھاکر بالعموم بے حد دھیرج دھرنے والے ٹھنڈے سبھاؤ کے دکھائی دیتے تھے۔ مگر آج دلیپ نے ان کے حساسات کو بری طرح مجروح کر دیا تھا۔ اب وہ اس وقت کسی طرح کی بات کرنے کے روادار نہ تھے۔ دلیپ خاموش ہو کر وہاں سے سٹک گیا۔ اس کے جانے کے بعد جرنیل چاچا دبے پاؤں دیوان خانے میں داخل ہوئے اور خلاف معمول گردن جھکا کے اپنے بڑے بھائی کے قریب کھڑے ہو گئے اور مؤدب ہو کر بولے۔ "بھیّا!"

بڑے ٹھاکر نے حقّہ گڑگڑاتے ہوئے تلخ لہجہ میں کہا۔ "ہوں؟"

ان کی آواز میں ابھی تک غصّہ تھا۔

"بہت سے نوکر تو چلے گئے ہیں لیکن جو رہ گئے ہیں وہ بھی کل سے کام پر نہیں آئیں گے!"

"کیوں نہیں آئیں گے؟"

"پیسہ مانگتے ہیں۔"

بڑے ٹھاکر نے جھنجلا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ پھر اکدم انہوں نے اپنی انگلی سے انگوٹھی اتار دی اور اسے آگے بڑھا کر بولے۔ "یہ لو انگوٹھی بیچ کر انہیں پیسے دے دو!"

جرنیل چاچا نے سر جھکا کر ہات بڑھا کر انگوٹھی لے لی اور بڑے ٹھاکر نے اپنے چھوٹے بھائی سے آنکھیں چرا لیں اور منہ پھیر لیا۔

***

جرنیل چاچا انگوٹھی لے کر سیدھے میاں صدرالدین پٹواری کے مکان پر گئے اور اس سے بولے "تمہارا کج کلفا خریدنے آیا ہوں۔ میاں صدرالدین!"

میاں صدرالدین کڑک کر بولے "جاؤ۔ جاؤ۔ ٹھاکر۔ تم کیا کھا کر میرے کج کلفے کا نام لوگے۔ ساری دنیا میں میرے کج کلفے مرغ کا جواب نہیں ہے۔ چڑھتی کشتی کا مرغ ہے۔ کوئی کچیا مرغ نہیں ہے۔ تم نے اس کی جھل جھڑپ نہیں دیکھی جب یہ تال مار کے پالے میں آگے بڑھتا ہے تو ایک ہی وار میں دشمن کی گردن لوٹنی کر دیتا ہے۔"

جرنیل چاچا تو کج کلفے کی قدر و قیمت سے بخوبی واقف تھے۔ اس لئے میاں صدرالدین کی شیخی ٹھنڈے دل سے سنتے رہے۔ وہ کبھی اپنے راجپوتی جلال میں آجاتے تو یہ سودا کس طرح ہوتا۔ اس لئے خاموشی سے سنتے رہے۔ پھر جب میاں صدرالدین اپنے مرغ کی تعریف کرتے کرتے رکے، تو فوراً بیچ میں لقمہ دے کر بولے۔

"اسی لئے تو خریدنے آیا ہوں میاں! بولو کیا لوگے؟"

"کیا لوگے؟ میری بے عزتی کیوں کرتے ہو ٹھاکر؟" میاں صدرالدین فخریہ

انداز میں گردن اٹھا کر بولے۔ "تم راجپوت ہو تو میری رگوں میں بھی چنگیزی خون دوڑتا ہے۔ جانتے ہو میرا کنج کلغہ تو ہفت اقلیم میں نایاب ہے۔ نایاب! اس کی قیمت کون لگا سکتا ہے۔ یہ اس کے بزرگ ایران سے آئے تھے!"

جرنیل چاچا چند لمحے چپ رہے۔ سر جھکائے ہوئے۔ آخر انہوں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور بولے۔ "لو میں بھی اپنے بزرگوں ہی کی ایک پرانی نشانی اس مرغ کے عیوض تمہیں پیش کرتا ہوں۔ اسے لے لو۔ انکار مت کرنا!"

یہ کہہ کر جرنیل چاچا نے بڑے کٹا کر کی دی ہوئی سونے کی بیش قیمت انگوٹھی اپنی جیب سے نکالی اور میاں صدرالدین کی ہتھیلی پہ دھر دی!

میاں صدرالدین چند لمحے خاموش رہے۔ پھر ان کی مٹھی بند ہو گئی اور وہ سر جھکائے ہوئے کچھ سوچتے ہوئے اندر چلے گئے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد جب دالان میں واپس آئے تو ان کی بغل میں کنج کلغا تھا اور ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اور وہ کنج کلغے کو جرنیل چاچا کے حوالے کرتے ہوئے رندھے ہوئے گلے سے بولے "لے جاؤ۔ اس کو فوراً لے جاؤ۔ یہ میری آنکھوں کے سامنے رہا تو شاید میں اپنا ارادہ بدل دوں (سسکی لے کر) میں نے اس مرغ کو اپنے بیٹے کی طرح پالا ہے!"

میاں صدرالدین کو آبدیدہ ہوتے دیکھ کر خود جرنیل چاچا کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ کنج کلغے کو بڑے پیار سے اپنی گودی میں لے کر بولے۔ "میاں جی! میں بھی اسے اپنے بیٹے کی طرح رکھوں گا!"

"اور ہفتے میں دو بار اسے چکھی دینا، ورنہ اس کا پیٹ خراب ہو جائے گا۔ بڑا کیٹ مرغ ہے یہ! گندی غذائیں نہیں کھاتا!"

"ایسا ہی کروں گا میاں جی!"

میاں صدرالدین اپنے مرغ کی طرف دیکھ کر روتے ہوئے بولے۔ "جاؤ میرے بیٹے جاؤ تمہارا ہمارا اتنا ہی ساتھ تھا۔"

جرنیل چاچا فوراً مرغ کو بغل میں داب کر جلدی جلدی سے وہاں سے رخصت ہوئے۔ کہیں میاں صدرالدین اپنا ارادہ نہ بدل دیں۔ مکان سے باہر نکلتے ہی انہوں نے دوڑ لگائی اور راستے کے موڑ پر جھاڑیوں کی قطار کے پیچھے غائب ہوگئے! آج جرنیل چاچا اس قدر خوش تھے گویا ہفت اقلیم کی دولت ان کے ہاتھ آگئی ہو۔!

گھر کے حالات دن بدن خراب ہوتے گئے اور دلیپ نے دیکھا کہ دن بہ دن دیوان خانے میں سے پرانے نوادر اور قیمتی اشیاء غائب ہونے لگیں۔ بڑے ٹھاکر تو اپنی شطرنج کی بازی میں اس قدر غلطاں دکھائی دیتے تھے کہ اب ان سے کچھ کہنا سننا فضول تھا۔ ایک رات دلیپ نے خود ہی جاگ کر دیوان خانے میں پہرہ دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ چور کون ہے؟

پہلی دو راتوں میں تو اس کی تلاش بیکار گئی۔ نہ چور آیا نہ کوئی چیز غائب ہوئی۔ تیسری رات میں بھی آدھی رات تک کچھ نہ ہوا اور دلیپ ہار کر واپس اپنے کمرے میں جانے کی سوچ رہا تھا کہ اتنے میں دروازہ پر کھٹکا ہوا اور دلیپ جلدی سے بڑے ٹھاکر صاحب کے تخت کے نیچے چھپ گیا۔

کوئی دبے پاؤں گھپ اندھیرے میں اندر آرہا تھا۔ پاؤں کی چاپ اور

سانس کی آواز قریب ہوتی گئی ۔

پھر ایک دیا سلائی جلی اور اس دیا سلائی سے ایک موم بتی اور اس موم بتی کی روشنی میں دلیپ نے دیکھا کہ یہ تو گجیندر سنگھ ہے اور وہ اپنے دادا مرحوم کی تصویر سے چاندی کا فریم اتارنے میں مصروف ہے اور فریم اتارتے ہوئے اپنے دادا جان سے باتیں بھی کئے جارہا ہے ۔ اس کی سانس کی آمد و رفت سے معلوم ہوتا تھا کہ بے حد پئے ہوئے ہے ۔

"آپ تو ولایت سے وہسکی منگاتے تھے دادا جان! آپ کو کیا معلوم آپ کا بیٹا آج کل کیسی بری شراب پی رہا ہے اور وہ بھی کتنی کم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ معاف کرنا دادا جی شراب کی ٹوٹ بہت بری ہوتی ہے ۔ خیر آپ کو تو خود بھی معلوم ہوگا مگر آپ اچھے زمانے میں تھے ۔ اچھے سے اچھا کھا پی کر گذر گئے ۔ مصیبت تو آپ کے پوتے کی ہے ۔ دیکھئے نا ۔ میں یہ چاندی کے فریم ——— اس لئے لے جا رہا ہوں کہ انہیں بیچ کر شراب پیوں گا اور شراب اس لئے پیئوں گا کہ اسے پی کر وہ لاجواب شاہکار بناؤں گا جسے بیچ کر میں آپ کی تصویر کے گرد چاندی کے فریم کے بجائے سونے کا فریم لگاؤں گا ۔ معاف دادا جی! میری نیت میں کھوٹ نہیں ہے ۔ صرف شراب کی ٹوٹ ہے !"

اسی طرح باتیں کرتے ہوئے مصوّر نے تصویر کا سارا فریم نکال لیا اور اُسے بغل میں داب کر چلنے لگا ۔ دلیپ نے یہ موقع غنیمت جانا ۔ وہ تخت کے نیچے سے نکل کر مصوّر کی گردن ناپنے والا ہی تھا کہ عین اسی وقت دیوان خانے کا دروازہ پھر کھلا اور آہٹ ہوتے ہی دلیپ پھر تخت کے نیچے دبک گیا اور ادھر مصوّر بھی ایک کونے میں دبک گیا اور عین اسی وقت ان لوگوں نے اپنی اپنی کمین گاہ سے دیکھا کہ چوڑیوں والے چاچا اور لوکیندر سنگھ مسکین یعنی شاعر چاچا آہستہ آہستہ

قدموں سے چاروں طرف احتیاط سے دیکھتے ہوئے اندر آرہے ہیں۔

اندر آکر شاعر چاچا نے لالٹین ایک کونے میں رکھ دی اور پھر شاعر چاچا نے چوٹیوں والے چاچا کی طرف دیکھا اور دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ پھر شاعر چاچا نے نیچے زمین کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں فرش پر ایک بڑا ایرانی غالیچہ بچھا ہوا تھا۔

شاعر چاچا نے ایک طرف سے اور چوٹیوں والے چاچا نے دوسری طرف سے ایرانی غالیچے کو لپیٹنا شروع کیا۔ اور جب اسے لپیٹ چکے تو انہوں نے دونوں سے کندھا لگا کر اس غالیچے کو اپنے شانوں پر اٹھالیا اور جس خاموشی سے وہ اندر آئے تھے اسی خاموشی سے وہ اس غالیچے کو اٹھاتے ہوئے دیوان خانے سے باہر چلے گئے اور دلیپ سناٹے میں آکر دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ وہ کس کو چور کہے اور کس سے باز پرس کرے۔ اب اس نے مصوّر سے بھی کچھ پوچھنا بیکار سمجھا اس لئے کچھ عرصے کے بعد جب گجیندر سنگھ بھی چاندی کے فریم اٹھائے ہوئے دبے پاؤں دیوان خانے سے نکلا تو دلیپ بھی اپنی پناہ گاہ سے برآمد ہوا اور مایوس اور ملول ہو کر سر جھکائے دیوان خانے سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

اس واقعے کے چند دن کے بعد جب دلیپ کچھ کاغذات لئے بڑے ٹھاکر صاحب سے ملنے کے لئے دیوان خانے میں آیا تو اس نے دیکھا کہ اکثر تصویروں سے چاندی کے فریم غائب ہیں اور فانوس، کانچ کے ہنڈولے اور بہت سا فرنیچر اور ساز و سامان مع ایرانی غالیچوں کے ندارد! اور ان سب باتوں سے بے خبر بڑے ٹھاکر صاحب مہاجن کرپا شاہ کے ساتھ شطرنج میں منہمک ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد بڑے ٹھاکر صاحب نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے حقّے کو ٹھنڈا پا کر کہا۔ "ارے یہ چلم تو ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ کوئی تازہ چلم بھر کر لائے؟"

اتنا کہہ کر بڑے صاحب نے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ لیکن کوئی ملازم موجود نہ تھا۔ گجیندر سنگھ نے اس موقع پر چلم اٹھائی اور بولا۔" میں نئی چلم بھر کے لاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ حقے پر سے چلم اٹھا کے باہر چلا گیا۔

بڑے ٹھاکر پھر کھیلنے میں مصروف ہو گئے۔ دلیپ نے کاغذات ان کے سامنے بڑھا کر کہا۔" ان پر دستخط کر دیجئے!"

"یہ کیا ہے؟" بڑے ٹھاکر نے پوچھا۔

"جو زمین ہمارے خاندان کے لوگوں کے حصّے میں آئی ہے۔ ان سب کو ملا کر ایک فارم کھول رہا ہوں۔ کوآپریٹیو فارم!"

بڑے ٹھاکر نے بیزار ہو کر جلدی جلدی دستخط کر دیئے اور پھر شطرنج میں مصروف ہو گئے۔ اتنے میں گجیندر سنگھ نئی چلم لے کر آ گیا۔ ٹھاکر نے ذرا خوش ہو کر حقہ گڑگڑایا۔ شطرنج کی چال چلتے ہوئے بے دھیانی میں ان کے پاؤں دیوان خانے کے ننگے فرش سے ٹکرائے اور انہیں کچھ عجیب سا معلوم ہوا۔ بولے۔" ارے بھئی یہاں ایک غالیچہ ہوا کرتا تھا۔ ایسا میرا خیال ہے۔"

" ہوا کرتا تھا۔" کرپا شاہ نے دست بستہ ہو کر کہا۔" دیکھا تو میں نے بھی تھا۔ مگر عجیب بات ہے کل میں مِل مینیجر کی کوٹھی پر گیا تو اس کے ڈرائنگ روم میں بالکل اسی طرح کا غالیچہ بچھا ہوا تھا!"

دلیپ بولا۔" مِل مینیجر کی کوٹھی میں ہمارا غالیچہ کیسے پہنچ گیا؟"

گجیندر سنگھ نے جلدی سے کہا۔" میرے خیال میں چڑیوں والے چاچا جی سے پوچھا جائے تو شاید وہ کچھ بتا سکیں!"

دلیپ نے پلٹ کر تیز نگاہوں سے گجیندر سنگھ کو تاکتے ہوئے کہا۔" مگر ان تصویروں کے چاندی کے فریم بھی تو غائب ہیں!"

"عجیب اتفاق ہے ٹھاکر صاحب۔" کرپا شاہ بولا۔ "کل ہی میں نے مل منیجر کے گھر پر دیوان خانے کا غالیچہ دیکھا اور کل ہی کلو دیسی شراب کے ٹھیکیدار چاندی کے تین فریم میرے پاس لا کے بیچ گیا۔ گھر پر پڑے ہیں!"

شراب کے ٹھیکے دار کا ذکر آتے ہی مصور کا چہرہ لال ہو گیا۔ مگر وہ چپ رہا۔

دلیپ نے تیز نگاہوں سے اسے سر سے پیر تک دیکھا اور تیز آبی لہجہ میں بولا۔ "اب ان فریموں کے بارے میں کس سے پوچھا جائے گا؟"

مصور چبھتے ہوئے لہجہ میں کرپا شاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "صرف مجھ سے پوچھتے ہو اور ان سے نہیں پوچھتے ہو جو چوری کا مال خریدتے ہیں۔"

اتنا کہہ کر مصور بناوٹی غصہ دکھاتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔ دلیپ بھی اس کے پیچھے باہر نکل گیا۔ اس واقعہ کے دوران میں بڑے ٹھاکر صاحب کچھ نہیں بولے۔ سر جھکائے شطرنج کھیلتے رہے۔ بوڑھا ٹھاکر عیش و آرام کی زندگی گذار کر اپنی زندگی کی آخری منزل میں تھا۔ وہ نہ اب خود سدھر سکتا تھا نہ اس پوزیشن میں تھا کہ کسی دوسرے کو سدھار سکے۔ دلیپ کے دل میں اپنے خاندان کے سب سے بڑے بزرگ کے لئے غصہ کے بجائے رحم کا جذبہ پیدا ہوا اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مگر وہ اپنے آنسوؤں کو چھپاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

باہر جا کر اس نے دیکھا کہ حویلی کے کھلے آنگن میں چڑیوں والے چاچا اپنے ہاتھوں میں لوہے کی دو زنجیریں لئے چل رہے ہیں۔ ان زنجیروں سے دو لنگور بندھے تھے۔

دلیپ نے چڑیوں والے چاچا جی کو روک کر صاف صاف ہی پوچھ لیا۔ "کیا دیوان خانے کا بڑا غالیچہ آپ نے مل منیجر کے ہاں بیچا ہے؟"

اس براہ راست حملے سے چاچاجی ایک لمحے کے لئے گھبرا گئے۔ خاموشی سے دلیپ کا منہ تکنے لگے۔ پھر دھیرے دھیرے ان کا چہرہ شرم اور غصے سے سرخ ہونے لگا۔ آخر میں غصے نے فتح پائی اور وہ بھڑک کر بولے۔ "میں نے ایسا کون گناہ کیا ہے؟ کیا اس گھر کے سامان پر میرا کوئی حق نہیں۔ ہے ہے؟"

"مگر کم سے کم دس ہزار کا غالیچہ تھا" دلیپ نے تاؤ دلایا۔

"دس ہزار کا غالیچہ تھا تو کیا ہوا؟" چڑیوں والے چاچا فخریہ انداز میں بولے "یہ بھی تو دیکھو اس کے بدلے میں کیا لایا ہوں؟"

"کیا لائے ہو؟" دلیپ نے پوچھا۔

"یہ دو افریقی لنگور لایا ہوں۔" چاچا لنگوروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ "پچاس ہزار سے کم کی جوڑی نہ ہو گی۔ سارے ہندوستان میں ایسے لنگوروں کی جوڑی کسی کے پاس نہ ہو گی، جناب!"

دلیپ نے اپنا ماتھا پیٹ کر کہا۔ "اس حویلی میں پہلے ہی لنگوروں کی کیا کمی تھی جو آپ دو اور لنگور اٹھا لائے؟"

مگر ان احمقوں سے اب کہنا سننا فضول تھا۔ اس لئے دلیپ کٹھا کر بلرام سنگھ کے بنگلے پر جا کر اس سے ملا اور اس سے کہا کہ بلرام سنگھ کو حویلی کا سامان نہیں خریدنا چاہیئے تھا۔ دلیپ نے انتہائی معصومیت اور سنجیدگی سے بحث کا آغاز کیا۔ مگر بلرام سنگھ بڑی رعونت سے اس سے پیش آیا۔ دلیپ کو اس کی قطعاً توقع نہ تھی۔ اس لئے وہ حیرت میں رہ گیا۔ پھر بھی وہ کمال متانت سے اپنے نکتۂ نظر کی وضاحت کرتا رہا لیکن جوں جوں ٹھنڈے دل سے گفتگو کرتا جاتا تھا۔ بلرام سنگھ کے مزاج کا پارہ اوپر چڑھتا جاتا تھا۔ بالآخر دلیپ بحث کو کسی نتیجے پر نہ پہنچتا دیکھ کر وہاں سے بے نیل و مرام چلا آیا۔ مگر اس کے دل میں بلرام سنگھ کے لئے شدید نفرت گھر کر گئی۔ اور بلرام سنگھ کے

دل میں بھی دلیپ کو دیکھ کر یہی جذبہ ابھرا تھا۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ آدمی ایک دوسرے کو دیکھ کر پہلی نظر میں ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ اگر پہلی نظر میں محبت ہو سکتی ہے تو نفرت کیوں نہیں ہو سکتی؟ اور یہاں تو کم سے کم دلیپ کے لئے اس نفرت کا جواز موجود تھا۔ چنانچہ وہ اپنے دل میں بلرام سنگھ کے لئے بہت برے تاثرات لے کر لوٹا۔!

دلیپ کی کوششوں کے باوجود حویلی کی قرقی کا دن آ گیا۔ اور سیٹھ دھنپت رائے اپنے مل مینجر بلرام سنگھ کے ہمراہ بیلف اور پولیس کے سپاہی اور ڈونڈی والے کو لے کر حویلی کے دروازے پر پہنچ گیا۔ بلرام کا خیال تھا کہ حویلی کے ٹھاکروں کی جانب سے مزاحمت ہوگی اور وہ مزاحمت چاہتا بھی تھا تاکہ ٹھاکروں کی اچھی طرح بے عزتی کر سکے۔ اسے حویلی کے ٹھاکروں سے کسی طرح کی پرخاش نہ تھی۔ مگر اس کے مزاج کی افتاد ایسی تھی کہ اسے دوسروں کی بے عزتی کرنے میں مزہ آتا تھا۔ اس لئے وہ آج پوری طرح سے تیار ہو کر آیا تھا۔

مگر دلیپ نے اسے اس طرح کا کوئی موقع نہ دیا۔ سیٹھ دھنپت رائے کی پارٹی کے آتے ہی اس نے آگے بڑھ کر حویلی کی چابی اس کے ہاتھ میں تھما کر کہا۔ "ٹھیک ہے ہم نے قرضہ نہیں چکایا آپ قرقی لے کر آ گئے۔ اس لئے بڑے ٹھاکر صاحب نے حویلی کی چابی آپ کی نذر کرنے کو کہا ہے۔ ہم نے ساری حویلی آپ کے لئے خالی کر دی ہے اور ہمارا خاندان گیسٹ ہاؤس میں منتقل ہو گیا ہے۔ صبح تک ہم یہ مہمان خانہ بھی خالی کر دیں گے وہ بھی اگر آپ کی اجازت ہو تو۔ ورنہ ابھی خالی کر سکتے ہیں!"

"ہاں۔ ہاں۔ ابھی خالی کر دو۔" بلرام سنگھ نے درشت لہجہ میں کہا۔
"نہیں۔ نہیں اس کی کیا ضرورت ہے؟" سیٹھ دھنپت رائے نے مسکرا

کر نرم اور ہمدردی بھرے لہجہ میں کہا۔ "جب تک آپ کا کوئی دوسرا بندوبست نہ ہو جائے آپ سب لوگ اسی گیسٹ ہاؤس میں رہیئے۔ چھ مہینے۔ سال دو سال۔ جب تک آپ کا جی چاہے اسے استعمال کیجئے!"

دلیپ نے گردن کو ذرا سا خم کیا اور بولا۔ "آپ کی مہربانی ہے سیٹھ جی۔ مگر مہمان دو دن ہی کا اچھا ہوتا ہے۔ دو سال کا اچھا نہیں ہوتا!"

اتنا کہہ کر دلیپ نے دونوں پھاٹک اچھی طرح کھول دیئے اور سیٹھ اور اس کی پارٹی کو اندر آنے کی دعوت دی۔!

سارا گیسٹ ہاؤس سنگرا خاندان کے بچوں، مردوں اور عورتوں اور ان کے ساز و سامان سے پٹا پڑا تھا۔ ایک طرف چڑیوں والے چاچا کے پنجرے رکھے تھے دوسری طرف جرنیل چاچا کے مرغ کڑکڑا تے تھے۔ ایک کونے میں گجیندر سنگھ اپنی پتنگیں، ڈور اور چرخیاں سجائے بیٹھے تھے۔ ایک کونے میں گجیندر سنگھ اپنی نامکمل تصویروں۔ ایزل۔ رنگ کے ڈبوں اور برشوں کو سنبھالے بیٹھا تھا۔ عورتیں اپنی اپنی گودمیں اپنے اپنے پاندان سنبھالے بچوں کو مار کر پچکارتی تھیں اور پچکار کر پھر مارتی تھیں اور سسکیاں لے لے کر پان کھاتی تھیں اور پان کھا کھا کر آبدیدہ ہوتی جاتی تھیں اور ہات پھیلا پھیلا کر سیٹھ دھنپت رائے کے خاندان کو کوسنے دیتی تھیں۔

ایک کونے میں بڑے کٹھا کر شرم سے سر جھکائے مغموم اور مایوس بیٹھے چپ چاپ حقہ پی رہے تھے اور بوڑھی دادی تخت پوش پر بیٹھی خاموشی سے سب کو باری

باڑی دیکھ کر آنکھیں جھپکا لیتی تھیں اور دلیپ کہہ رہا تھا۔

"تو کون چلے گا میرے ساتھ کھیتوں پر؟ وہاں پر میں نے چھپر بندھوا دیئے ہیں سب کے لئے۔ ہل۔ بیل۔ بیج۔ کھاد یعنی کھیتی باڑی کا سب انتظام کر دیا ہے آپ لوگوں کے لئے رہنے سہنے کھانے پینے کا سب انتظام ہے۔ مگر ظاہر ہے وہاں شاہی ٹھاٹ نہ ہوں گے۔ سادہ زندگی ہو گی جیسے کہ کسانوں کی ہوتی ہے!"

دلیپ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا اور سب کے منہ دیکھنے لگا۔ ٹھاکروں میں سے کوئی نہ بولا۔ سوائے جرنیل چاچا کے اور انہوں نے بھی انکار میں سر ہلا کر کہا "جب سیٹھ دھنپت رائے نے ہمیں اس گیسٹ ہاؤس میں رہنے کے لئے سال دو سال کی اجازت دیدی ہے تو باہر کھیتوں میں جا کر چھپروں میں رہنے کی کیا ضرورت ہے؟"

دلیپ نے چاروں طرف دیکھا۔ جب کسی نے جرنیل چاچا کی بات نہیں کاٹی تو وہ افسردہ ہو کر بولا۔ "خیر مجھے تو معلوم تھا آپ لوگوں کا کیا جواب ہو گا۔ اسی لئے میں نے تو آج سے اخبار میں فارم پر کام کرنے والوں کے لئے اشتہار بھی دے دیا ہے بس تو ہر صورت میں کھیتوں پر کام کروں گا۔ آپ کی مدد کے ساتھ یہ کام ہوتا تو بہت اچھا ہوتا۔ اس گھر کی حالت بدل جاتی۔ اس خاندان کی زندگی سنور جاتی۔ ان چھوٹے چھوٹے بچوں کا مستقبل بھی بن جاتا۔ بہر حال مجھے تو کام کرنا ہی ہے۔ زمینداری تو گئی اور اس کے ساتھ زمینداری کے ظلم اور اس کے عیش و آرام بھی گئے۔ اب جو اپنے ہاتھ سے کام کرے گا وہی سکھی رہے گا اور میری دلی خواہش یہ ہے کہ آپ سب لوگ میرے ساتھ فارم پر چلیں اور کھیتی باڑی شروع کریں۔!"

دلیپ اتنا کہہ کر چپ ہو گیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ مگر کسی ٹھاکر نے اس سے آنکھ نہیں ملائی۔ سب کے سر جھکے ہوئے تھے اور وہ سب کے سب چپ چاپ بے آواز گویا دم سادھے ہوئے بیٹھے تھے۔

دلیپ نے چلاّ کر کہا، "آخری بار پوچھتا ہوں کوئی چلتا ہے میرے ساتھ؟"
جب کوئی نہیں بولا تو دلیپ نے غصّے سے پیر پٹک کر کہا۔ "تو مرو یہاں پر۔ میں تو جاتا ہوں۔ ابھی جاتا ہوں!"

اتنا کہہ کر وہ تیزی سے گیسٹ ہاؤس سے باہر نکل گیا!

اس کے جانے کے بعد گیسٹ ہاؤس میں کافی دیر تک سنّاٹا رہا۔ آخر دادی ماں نے دھیرے دھیرے دو تین بار کھانس کر اپنا گلا صاف کیا اور بڑی افسردگی سے سر ہلا کر بولیں، "گھر میں ایک عقل والا تھا وہ بھی چلا گیا!"

اس پر گھر کے سب افراد اس طرح بھونچکے ہو کر دادی ماں کی طرف دیکھنے لگے جیسے ابھی ان پر کسی نئی حقیقت کا انکشاف ہوا ہو۔ ان کے احمقانہ چہرے دیکھ کر دادی ماں کا غصّہ بڑھنے لگا۔ بولیں۔ "اس طرح حیران ہو کر اُلّوؤں کی طرح آنکھیں پھاڑ کر میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ کوئی غلط کہہ رہی ہوں؟"

اس پر فوراً سب کٹھ ملاّؤں نے اپنی نظریں جھکا لیں۔ دادی اماں بڑے کٹھا کر کی طرف مڑ کر بولیں۔ "سمجھتے ہو میں کیا کہہ رہی ہوں؟ مگر تم کیا سمجھو گے؟ زندگی بھر تم نے حقّہ اور شطرنج کے سوا کچھ سمجھا ہی کیا ہے؟"

اس پر چڑیوں والے چاچا نے آہستہ سے سر ہلا کر گویا دادی اماں کی حامی بھری تو وہ اور بھڑ گئیں اور چڑیوں والے چاچا کی طرف پلٹ کر بولیں۔ "تم جو سر ہلا رہے ہو چڑی مار! کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ ہاتھ پاؤں بھی ہلانے چاہئیں؟"

اس پر چڑیوں والے چاچا نے پھر اسی طرح سر ہلایا تو چلاّ کر بولیں۔ "کیا پوپٹ کی طرح سر ہلاتے ہو؟ عقل ٹھکانے ہے کہ نہیں؟"

چڑیوں والے چاچا کھِسیا ہو کر بیٹھ گئے۔ تو دادی ماں جرنیل چاچا سے مخاطب ہوئیں۔ "لے او مرگی والے! ایک انڈہ پچانے کی طاقت تو ہے نہیں تم میں۔ اور

لڑاتے ہو مرغے ؟ اب اگر کام نہیں کروگے تو یہ زندگی تم کو مرغا بنادے گی !"

اس فقرے پر شاعر چاچا بے اختیار داد دینے لگے۔ "واہ، واہ، دادی ماں کیا نادر تشبیہہ استعمال کی ہے۔ واللہ جی خوش ہوگیا۔ سبحان اللہ !"

فوراً دادی ماں شاعر چاچا کی طرف پلٹ کر حقارت آمیز لہجہ میں بولیں۔ "ابے قلم گھسیٹے۔ تو کیا دن رات کبیتا بانچتا ہے؟ تجھ سے پہلے تیرے باپ سے بھی یہ شعر سن چکی ہوں۔ اپنے باپ کے اور ادھر اُدھر دوسرے لوگوں کے شعر چرا کے لوگوں کو سناتا ہے اور کہتا ہے میں نے لکھے ہیں !"

جب دادی ماں نے شاعر چاچا کی چوری بے نقاب کی تو خاندان کی چند عورتیں بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑیں تو دادی ماں کو فوراً موقع مل گیا۔ وہ پلٹ کر ان سے کہنے لگیں۔ "تم کیا کیا کھی کھی ہنستی ہو؟ دن بھر اپنے کٹوروں میں پان کٹولس ٹھولس کر جو تم تاش کی بیگم اور حکم کا ایکہ چلاتی ہو، کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ تمہارا تاش کا محل آج دھڑام سے گر پڑا ہے؟"

گھر کی عورتوں کی ہنسی ایکدم رک گئی۔ اکدم سنجیدہ اور شرمندہ ہوکر انہوں نے اپنی گردن جھکالی اور دادی ماں نے ان کے مضمحل اور مایوس بچوں کے چہروں کو دیکھتے ہوئے آبدیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "کبھی یہ سوچا ہے کہ ان غریب بچوں کا کیا ہوگا ؟۔ جیسے تیسے تمہاری تو بزرگوں کی کچی کھچی کمائی پر زندگی بیت گئی۔ مگر ان بچوں کا کیا ہوگا ؟ کھیتوں پہ کام نہیں کروگے تو ان بچوں کو کھلاؤگے کہاں سے؟"

بڑے ٹھاکر بولے "مگر۔ دادی ماں۔ ہم اونچی ذات کے ٹھاکر ہیں۔ راجپوت ہیں۔ سورج ونشی خاندان سے ہیں۔ ہماری سات پشتوں میں آج تک کسی نے ہل کو ہات نہیں لگایا ہے !"

دادی ماں گرجکر بولیں "تجھ کو تیرے سورج ونشی کا اتہاس بتاؤں؟ جب

شری رام کو بن باس ملا تو کیا وہ اپنے ہات سے جنگلوں میں شکار نہیں کرتے تھے ؟
کیا سیتا میا ایک چھوٹی سی کٹیا میں اپنے ہات سے کھانا نہیں پکاتی تھیں ؟ نکمّے ! نکھٹّو !
خود تو کام کرتے نہیں ہو اور دوش دیتے ہو اپنے پرکھوں کو ؟ کدھر ہے میری چھڑی ؟"

شاعر چاچا نے اٹھ کر ڈرتے ڈرتے چھڑی دادی ماں کے ہات میں تھمائی ۔
چھڑی کا سہارا لے کر دادی ماں تخت سے اٹھ بیٹھیں اور دھیرے دھیرے باہر جاتی ہوئی بولیں :" میں تو جاتی ہوں اپنے پوتے کے پاس کھیتوں میں ! جس کو یہاں رہنا ہے رہے ، جس کو میرے ساتھ آنا ہے آ جائے !

شام کے بڑھتے ہوئے سایوں میں پالن گڈھ کے درمیان ایک کچی پگڈنڈی پر ایک بوڑھی عورت لٹھیا ٹیکتی ہوئی جا رہی تھی ۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کے دو پوتے چل رہے تھے ۔ ان کے پیچھے پیچھے چند عورتیں تھیں ۔ ان کے پیچھے پیچھے سنگرام خاندان کے ٹھاکر سر جھکائے ایسے چل رہے تھے جیسے پھانسی کے تختے پر جا رہے ہوں ۔ !

جب دلیپ نے دادی ماں کے چرن چھوئے ۔ تو وہ بولیں ۔" لے آئی ہوں میں تمہارے نکھٹوؤں کو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !"

اس پر جرنیل چاچا کسی قدر ڈھٹائی سے بولے ۔" ہم نے سوچا تم اس سنسان ویران جگہ پر اکیلے کیسے رہو گے ؟ اس لئے ہم لوگ آ گئے !"

" مجھے تو کھلے میں رہنا بہت پسند ہے " شاعر چاچا رومانی انداز میں بولے

"یہ پھیلی ہوئی دھرتی۔ یہ کھلا آسمان۔ یہ پھیلے ہوئے کھیت۔ میری تو کب سے آرزو تھی کہ کسانوں کی طرح زندگی بسر کروں!"

دلیپ مسکرا کر چپ ہو گیا لیکن رات کو جب کھانے پر سب لوگوں کو آرہر کی پتلی دال اور سخت چپاتیاں کھانے کو ملیں تو شاعر چاچا نے بے حد نازک مزاج سے کفے گھبرا کر کہا۔ "یہ روٹی تو مجھ سے نہیں کھائی جاتی!"

دلیپ بولا۔ "کسان یہی کھانا کھاتا چاچاجی!"

کھانے سے فارغ ہو کر شاعر چاچا نے دلیپ سے پوچھا۔ "میرا کمرہ کہاں ہے؟"

"کمرہ؟" دلیپ نے پوچھا۔

"ہاں۔" شاعر چاچا بولے۔ "مجھے تو ایک الگ کمرہ چاہیئے۔ فکر سخن کے لیئے!"

"اور مجھے بھی!" گجیندر سنگھ بولا "ورنہ میری تصویروں کے کینوس تباہ ہو جائیں گے!"

"اور میری چڑیوں کے پنجرے کہاں رہیں گے؟" چڑیوں والے چاچا دلیپ سے پوچھنے لگے "مجھے تو ہر حال میں ایک الگ کمرہ چاہیئے!"

دلیپ ان سب کو ایک بڑے چھپر کی طرف لے گیا اور چھپر کا درواز کھول کر اس نے سب کو اندر آنے کی دعوت دی۔ اندر آ کر ٹھاکروں نے دیکھا کہ ایک لمبا سا چھپر ہے۔ جس کے فرش پر یہاں سے وہاں تک، گھاس بچھی ہے اور کسی قسم کا ساز و سامان اس میں موجود نہیں ہے!

"یہ کیا ہے؟" شاعر چاچا نے گھبرا کر پوچھا۔

"یہ مردوں کا کمرہ ہے۔ میں نے دو چھپر بنوا دیئے ہیں۔ فی الحال ایک

عورتوں کے لئے دوسرا مردوں کے لیے!"

شاعر چاچا چیخ کر بولے۔ "ہم اس میں رہیں گے؟"

"کسان یہیں رہتا تھا چاچا جی۔" دلیپ نے مسکرا کر کہا۔

"تو چارپائیاں کہاں ہیں؟" جرنیل چاچا نے حیران ہو کر پوچھا۔ "ہم سوئیں گے کہاں پر؟"

"یہیں زمین پر!" دلیپ بولا۔

"یہیں زمین پر؟" شاعر چاچا حیرت سے چیخے۔

"کسان یہیں سوتا تھا۔" دلیپ نے جواب دیا۔

رات کو دلیپ بڑے کمرے میں جھونپڑے کے ایک کونے میں گھاس پر سو رہا تھا کہ اسے شاعر چاچا نے جگا دیا۔ دلیپ نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو شاعر چاچا ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے ہاتھ میں پانی کی لٹیا لئے نظر آئے۔ دلیپ کو آنکھیں کھولتے دیکھ کر بولے۔ "باتھ روم کدھر ہے؟"

"باہر جدھر بھی جاؤ باتھ روم ہی باتھ روم ہے چاچا!"

"مگر باہر تو اندھیرا ہے۔" شاعر چاچا کی آواز خوف سے کپکپا رہی تھی۔

"اندھیرا ہے تو کیا" دلیپ آہستہ سے بولا۔ "کسان اسی اندھیرے میں باہر جاتا تھا۔"

یہ کہہ کر دلیپ نے کروٹ بدلی اور منہ پھیر کر سو گیا۔ دلیپ سے مایوس ہو کر شاعر چاچا اپنے بڑے بھائی جرنیل چاچا کے پاس گئے اور ان کا کندھا ہلا ہلا کر اسے جگانے لگے۔ اور جب جرنیل چاچا اپنے خواب خرگوش سے جاگے تو شاعر چاچا یوں گویا ہوئے۔

"جرنیل بھائی۔ جرنیل بھائی۔ ایک بات پوچھوں؟"

"آدھی رات کے وقت؟" جرنیل چاچا نے خفا ہو کر کہا۔ پھر شاعر چاچا کا خوفزدہ چہرہ دیکھ کر بولے۔ "کیا ہے؟"

"کیا کسان اندھیرے میں باہر جاتا تھا؟" شاعر نے پوچھا۔

"جہنم میں جاتا تھا۔" جرنیل چاچا خفا ہو کر بولے۔ "یہ آدھی رات کے وقت جگا کے کیا سوال پوچھا ہے؟ ہٹو مجھے سونے دو!"

مگر شاعر چاچا نے پھر بڑی عاجزی سے کہا۔ "جرنیل بھائی۔ مجھے باہر جانا ہوگا۔ مگر مجھے ڈر لگتا ہے۔ تم میرے ساتھ باہر چلو!"

"نہیں۔ مجھے سونے دو۔" جرنیل چاچا نے کروٹ بدلنی چاہی۔ مگر شاعر نے انہیں روک کر کہا۔ "تمہیں رستم ہند کی قسم۔ تمہارے پیارے رستم ہند کی قسم میرے ساتھ دو منٹ کے لئے باہر چلیے!"

جرنیل چاچا انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھے۔ بولے "رستم ہند کا نام لے لیا تم نے اتنی بڑی قسم دلادی تم نے۔ اب تو مجھے چلنا ہی پڑے گا۔ لاؤ یہ لالٹین میرے ہات میں دے دو۔!"

لالٹین ہات میں لے کر جرنیل چاچا باہر چلے۔ ان کے پیچھے پیچھے سہمے ہوئے ان کے بھائی شاعر چاچا ہات میں پانی کی لٹیا لے کر چلے۔ باہر گھپ اندھیرا تھا۔ ایک بڑے نیم کے پیڑ پر انہیں دو خوفناک روشنیاں چمکتی ہوئی نظر آئیں۔ بڑی بڑی لال۔ لال۔ پیڑ کی شاخ پر۔ ان روشنیوں کو دیکھتے ہی شاعر چاچا کی گھگھی بندھ گئی اور جرنیل چاچا بھی اپنی ساری جرنیلی بھول گئے۔ تھر تھر کانپنے لگے۔ شاعر نے گھبرا کر اپنے بھائی کا ہات پکڑ لیا۔ اور رک رک کر بولا۔

"جرنیل بھائی ——— وہ ——— وہ ——— وہ ——— وہ دیکھتے ہو؟"

"شاعر بھائی کیا تم بھی وہی دیکھتے ہو جو میں دیکھتا ہوں؟" جرنیل چاچا نے گھبرا کر پوچھا۔

اتنے میں پیڑ کی شاخ پر بیٹھے ہوئے الو نے ایک خوفناک چیخ ماری اور اس کے چیخ مارتے ہی شاعر اور جرنیل نے بھی چیخ ماری اور لالٹین اور پانی کی لٹیا ان کے ہاتھ سے گر گئی اور وہ دونوں خوف سے چیختے ہوئے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوتے زمین پر گر گئے اور تقریباً بیہوش ہو گئے۔ ان کی چیخیں سن کر الو پر پھڑپھڑاتا ہوا نیم کے پیڑ سے اٹھا اور تاریک فضا میں اڑ کر غائب ہو گیا۔

چیخوں کی آواز سن کر دلیپ اور دوسرے گھبرا کر دوڑتے ہوئے باہر آئے۔ اور سہارا دے کر جرنیل چاچا اور شاعر چاچا کو جھونپڑے کے اندر لے آئے اور جب دلیپ نے بتایا کہ پیڑ پر کوئی جن بھوت نہیں بیٹھا تھا۔ الو بیٹھا تھا۔ تو سب کی جان میں جان آئی۔



ایک دن دلیپ کو فارم کے کسی ضروری کام کے سلسلے میں شہر جانا پڑا۔ اس نے اپنے شاعر چاچا کو جو خاندان میں نسبتاً معقول آدمی تھے اور کچھ پڑھے لکھے بھی تھے اور شاعری کرتے تھے اپنے پاس بلا کر کہا۔ "چاچا جی میں تو ایک ضروری کام سے شہر جا رہا ہوں۔ میرے جانے کے بعد ممکن ہے فارم پر کچھ لوگ انٹرویو کے لئے آئیں!"

"کیسا انٹرویو؟" شاعر چاچا نے پوچھا۔

"میں نے اخبار میں اشتہار دیا تھا کہ مجھے فارم پہ کام کرنے کے لئے کچھ نوجوانوں کی ضرورت ہے!"

"کیا ضرورت ہے؟" شاعر چاچا ذرا بھڑک کر بولے۔ "خاندان کے اتنے لوگ یہاں فارم پہ جمع ہیں۔ ہمارے ہوتے ہوئے تمہیں کسی باہر کے آدمی کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟"

"آپ دیکھ تو رہے ہیں۔ کس طرح کا کام ہونا ہے یہاں؟" دلیپ نے ذرا دھیمے لہجہ میں کہا تاکہ اس میں شکایت کا پہلو کم سے کم جھلکے۔ "بہر حال یہ ایک لمبی بحث ہے۔ شہر سے آکر اس مسئلے پہ بات کریں گے۔ آپ میری غیر حاضری میں اتنا کر لیجیئے کہ جو لوگ فارم پہ کام کرنے کے سلسلے میں آئیں ان کا انٹرویو لے لیجیئے گا۔!"

"لے لیں گے!" شاعر چاچا نے دلیپ کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔ "تم بے فکر ہو کر جاؤ۔"

چلتے چلتے دلیپ نے پھر کہا۔ "ذرا معقول آدمی رکھیئے گا دیکھ کر!"

"ہاں ہاں، سمجھ گئے۔" شاعر چاچا بولے۔ "اب تم جاؤ۔"

دلیپ کے جانے کے بعد بڑے ٹھاکر شاعر چاچا کے پاس آگئے۔ اور ان سے شطرنج کھیلنے پہ اصرار کرنے لگے۔ شاعر چاچا نے بتایا کہ "انہیں ابھی کھیتوں میں ہل چلانا ہے۔" "مگر ایک بازی سے کیا ہوگا؟" کہہ کر بڑے ٹھاکر نے اپنے چھوٹے بھائی کو پھسلا لیا اور دونوں شطرنج کھیلنے میں مصروف ہو گئے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد جب انہوں نے سر اٹھا کے دیکھا تو اپنے گرد بہت سے شہری اور دیہاتی نوجوانوں کو موجود پایا۔ یہ لوگ انٹرویو کے سلسلے میں آئے تھے فارم پہ کام کرنے کے لئے!

بڑے ٹھاکر نے چھوٹتے ہی اپنے سب سے قریب کھڑے ہوئے نوجوان سے پوچھا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟" مگر یہ ذمہ داری تو شاعر چاچا کے سپرد کی گئی تھی۔ اس لئے انہوں نے جلدی سے سب لوگوں کو ایک لائن میں کھڑا کیا اور بڑے ٹھاکر سے بولے۔ "انٹرویو ایسے لائن میں کھڑے کر کے لیا جاتا ہے۔ باری باری سب کو بلایا جاتا ہے اور ان سے سوال کئے جاتے ہیں اور جو سوالوں کا جواب سب سے اچھی طرح سے دے اسے نوکر رکھ لیا جاتا ہے۔ یہ ہے قاعدہ آج کل کے انٹرویو کا۔ آپ دیکھتے جائیے۔ میں ابھی آپ کی آنکھوں کے سامنے انٹرویو کر کے دکھاتا ہوں۔" شاعر چاچا اتنا کہہ کر سنبھل کر بڑے ٹھاکر کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گئے اور انہوں نے سب سے آگے کھڑے ہوئے ایک دیہاتی نوجوان کو اپنے سامنے بلایا اور اس سے سوال جواب کرنے لگے!

"کیا نام ہے تیرا؟"

"ہستو۔!"

"ہستو کیا نام ہوا؟"

"نام تو ہاشم ہے۔ پر سب ہستو ہستو کہویں۔" دیہاتی شرما کر بولا۔

"شطرنج آتی ہے؟" بڑے ٹھاکر نے فوراً بے چین ہو کر پوچھا۔

"نہیں۔ ہم کا جانیں!"

"تو جاؤ۔ ڈسمس!" بڑے ٹھاکر فوراً بول اٹھے۔

"شاعر چاچا نے بڑے بھائی کو سمجھایا ایسے انٹرویو نہیں لیا جاتا۔

"آپ دیکھتے رہیئے۔ میں بات کرتا ہوں!"

"اچھا تم بات کرو۔ تم ہی بات کرو۔ ہم چپ ہوئے جاتے ہیں۔" بڑے ٹھاکر کسی قدر آزردہ ہو کر بولے۔

اتنے میں دوسرا دیہاتی سامنے آچکا تھا۔ شاعر چاچا نے پوچھا۔

"تمہارا نام؟"

"طوطارام!"

"کہاں کے ہو؟"

"مادھوپور کے!"

"کچھ پڑھے لکھے ہو؟"

"چار جماعت پڑھا ہوں۔"

"جانتے ہو امیر مینائی کون ہے؟"

"ہاں جانوں ہوں۔ امیر وہ ہووے جو غریب کا لہو چوسے!" طوطارام بے دھڑک بولا۔

"ارے احمق۔" شاعر چاچا خفا ہو کر بولے۔ "امیر مینائی ایک شاعر کا نام ہے۔ خیر۔ تمہارے ایسا گھامڑ ہمیں نہیں چاہیئے۔ جاؤ۔!"

وہ چلا گیا تو تیسرا دیہاتی سامنے آیا۔ ادھیڑ عمر کا تھا اور صورت شکل سے خاصہ تیز اور چالاک معلوم ہوتا تھا۔

شاعر چاچا نے اس کا سر سے پاؤں تک جائزہ لینے کے بعد پوچھا۔

"کیا کام جانتے ہو؟"

"سب جانتا ہوں۔" وہ کھیت مزدور جچے تلے لہجہ میں بولا۔ "ہلائی۔ بوائی۔ نلائی۔ ڈھلائی۔ کٹائی۔ سب جانتا ہوں۔ زمین کا سب کام جانتا ہوں"

"زمین کا سب کام جانتے ہو؟ اچھا تو بتاؤ؟ یہ زمین کس غزل میں ہے؟" شاعر چاچا نے پوچھا۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے درد کی دوا کرے کوئی

دیہاتی کسان ہکا بکا ہو کے شاعر چاچا کا منہ دیکھنے لگا۔ اور شاعر چاچا نے فتح مند نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ ان کی نگاہیں گویا صاف کہہ رہی تھیں "بڑے آئے تھے انٹرویو دینے کے لئے کر دیا نا چت ہیں نے ۔" پھر مربیانہ انداز میں کسان کی طرف دیکھ کر بولے ۔ "بولو۔ بولو۔ جواب دو!"

وہ بولا۔ "درد کی دوا تو بید جی جانیں ۔ حجور۔ ہم تو کھیت مجور ہیں ۔ کھیتی باڑی کا کام سب جانیں!"

"جاؤ۔ جاؤ۔ تمہیں اگر اس آسان شعر کی زمین نہیں معلوم ہے ۔ تو کھیتی باڑی کا کام ہماری زمین پر کیسے کر سکو گے ؟ بھاگو!"

اب جو تھے نوجوان کی باری آئی۔ یہ ایک نوجوان سکھ تھا۔ عمر مشکل سے بیس برس کے قریب ہوگی اور مہین خشخشی داڑھی ۔ سر پر اودے رنگ کی پگڑی باندھے ہوئے ایک ڈھیلی بش شرٹ اور پتلون میں تھا۔

"نام ۔ ؟" شاعر چاچا نے پوچھا۔

"موہن سنگھ!"

"کیا کام کرتے ہو ؟"

"آج کل بیکار ہوں!"

"کہاں تک تعلیم پائی ہے ؟"

"میٹرک پاس ہوں ۔" وہ لڑکا بولا ۔ "مگر میں تو یہاں کھیتی باڑی کے کام کے لئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !"

شاعر نے اسے فوراً ٹوکا۔ "زیادہ باتیں مت کرو ۔ جو پوچھا جائے وہی بتاؤ جانتے ہو یہ انٹرویو ہے ۔ انٹرویو ۔ !"

"بہت بہتر ۔" نوجوان سکھ نے سنبھل کر مودبانہ لہجہ میں کہا۔ "پوچھئے!"

ہم" شاعر چاچا نے اتنا کہہ کر قدرے توقف کیا۔ پھر بولے۔

وہ آئے اتنا تو میرؔ نے بھی دیکھا
پھر ان کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

"یہ شعر کس کا ہے ؟"

موہن سنگھ بولا۔ "میرؔ کا ہے !"

شاعر چاچا کا چہرہ اتر گیا۔ سوچ سوچ کر پھر بولے۔ "اچھا بتاؤ۔ یہ شعر کس کا ہے ؟

ریختی کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ
سنتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا !

موہن سنگھ بولا۔ "یہ غالبؔ کا ہے !"

اس پر شاعر چاچا قائل ہو گئے۔ بڑے ٹھاکر سے بولے۔ "لڑکا ذہین معلوم ہوتا ہے۔ اسے رکھ لینا چاہیئے !"

بڑے ٹھاکر بولے۔ "اس سے پوچھو۔ شطرنج جانتا ہے !"

پوچھنے سے پہلے ہی لڑکے نے جواب دیا "جی ہاں ! شطرنج بھی کھیل لیتا ہوں۔

بڑے ٹھاکر خوش ہو کر شاعر چاچا سے کہنے لگے۔ "رکھ لو۔ اسے تو ضرور رکھ لو۔ یہ نوجوان کام کا معلوم ہوتا ہے۔" پھر موہن سنگھ سے مخاطب ہو کر بولے۔ "ادھر آؤ۔ شطرنج کی ایک بازی ہو جائے !"

موہن سنگھ نے حیران ہو کر کہا۔ "مگر میں تو ادھر کھیتی باڑی کا کام کرنے آیا تھا۔ میں نے سنا تھا ادھر کھیتی باڑی کا کام ہوتا ہے !"

"ہوتا ہے۔ ہوتا ہے۔ وہ بھی ہوتا ہے۔" بڑے ٹھاکر اسے دلاسہ دیتے

ہوئے بولے۔ "پہلے تم ہم سے شطرنج کھیلو۔ پھر جب دلیپ شہر سے آجائے گا تو تم کو کام سے لگا دے گا!"

موہن سنگھ بڑے ٹھاکر کے ساتھ شطرنج کھیلنے لگا۔ اور شاعر چاچا نے باقی سب لوگ ڈسمس کر دیئے!

دوپہر کے قریب جب دلیپ ٹریکٹر کے سلسلے میں بات چیت کر کے شہر سے لوٹا، تو اس نے دیکھا ایک درخت کے نیچے اس کے مرغ باز چاچا اپنے ایک مرغ کو نہلا کر پونچھ رہے ہیں اور اس کی چونچ پر پاؤڈر چھڑک کر کہہ رہے ہیں۔ "اب جاؤ۔ کھیلو میرے رستم ہند!"

مرغ آزاد ہو کر کڑ کڑاتا ہوا اگر دن کھلائے ایک طرف کو چلا گیا۔

ایک چھپر کے نیچے دلیپ نے دیکھا کہ اس کا پتنگ باز چاچا ایک درجن بچوں کی لین ڈوری سمیت مانجھا تیار کر رہا ہے اور پتنگ بنا رہا ہے۔ ایک طرف چڑیمار چاچا اپنے چہیتے ہیرامن طوطے کے پنجرے کے سامنے اکڑوں بیٹھے اس سے کہہ رہے ہیں۔

"قلا بازی کھاؤ۔ ہیرامن۔ قلا بازی۔ کھا کے دکھاؤ!"

"کیوں دکھائیں؟" طوطا بولا۔ "تمہاری زمینداری ختم ہو گئی!"

دلیپ نے ایک اور چھپر پر نظر ڈالی۔ یہاں رسوئی تھی۔ اس چھپر میں دو تین کھٹیاں پڑی ہیں۔ یہاں ٹھکرائن پان کھا رہی تھی یا تاش کھیلنے میں مصروف

تھیں۔ ایک طرف چولھے میں دال اُبل اُبل کر باہر گر رہی تھی۔

دلیپ نے بیزار ہو کر نظر پھیر لیں تو سامنے کے کھیت میں شاعر چاچا ہل چلانے کی کوشش میں مصروف نظر آئے انہوں نے بیلوں کی جوڑی کسی نہ کسی طرح ہل کے آگے جوت دی تھی۔ اور اب بیلوں کے سامنے کھڑے ہو کر انتہائی شائستہ انداز میں ان سے فرما رہے تھے!

"اجی حضت - آگے بڑھیئے۔ آگے بڑھیئے۔ ہل چلایئے!"

مگر جوں جوں شاعر چاچا بیلوں کے آگے بڑھتے جاتے غریب بیل سر جھکا کر پیچھے ہٹتے جاتے اور شاعر چاچا پریشان ہو کر کہنے لگے۔

"یہ کیا تماشہ ہے۔ دنیا آگے بڑھتی جا رہی ہے آپ پیچھے ہٹتے جا رہے ہیں۔ واللہ ہل چلایئے۔ دیکھئے۔ یہ ساری زمین آپ کی قدم بوسی کے لئے انتظار کر رہی ہے۔ شاید اسی موقع کے لئے چچا غالب کہہ گئے ہیں۔

آگے بڑھ کر جو اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے!

جب اس پر بھی بیل آگے نہ بڑھے بلکہ خاموش نگاہوں سے شاعر چاچا کو دیکھ کر کان پھٹپھٹاتے رہے تو شاعر چاچا نے پریشان ہو کر کہا۔

"واللہ آپ داد تک نہیں دیتے۔ عجیب گھامڑ ہیں آپ بھی!"

اس پر دلیپ نے آگے بڑھ کر اور مسکرا کر کہا "چاچا۔ بیلوں کے آگے کھڑے ہو کر نہیں۔ بیلوں کے پیچھے کھڑے ہو کر ہل چلایا جاتا ہے!"

شاعر چاچا ایک دم بیزار ہو کر بولے۔ "عجب نا معقول طریقہ ہے صاحب ہل چلانے کا۔ ہم نے تو آج تک کسی محفل میں کسی کے پیچھے کھڑے ہو کر شعر نہیں پڑھا۔ پھر ہم کسی کے پیچھے کھڑے ہو کر ہل کیسے چلا سکتے ہیں؟ ناں صاحب! ایسی بد تمیزی ہم سے نہ ہو گی۔!"

یہ کہہ کر شاعر چاچا کھیت چھوڑ کر چلے گئے اور دلیپ پلٹ کر مرغ باز چاچا کے پاس گیا اور ان سے کہنے لگا۔

"میں آپ کو گھاس کاٹنے کے لئے کہہ گیا تھا؟"

مرغ باز چاچا کڑک کر بولے "دیکھتے نہیں ہو۔ ابھی تو میں اپنے رستم ہند کو نہلا کر فارغ ہوا ہوں۔ مارے مشقت کے کمر دوہری ہوئی جا رہی ہے۔ پھر بھی میں گھاس ضرور کاٹ دیتا۔ مگر یکایک مجھے خیال آیا آج تو اتوار ہے اور اتوار کے روز کوئی شریف آدمی کام نہیں کرتا!"

دلیپ بولا "نہیں چاچا جی۔ کسانوں کو تو اتوار کے روز بھی کام کرنا پڑتا ہے!"

"صاحب یہ تو ہم کسانوں پر بڑا ظلم ہے۔" مرغ باز چاچا ایکدم بول اٹھے۔ "بڑی ناانصافی ہے کہ اتوار کے روز بھی ہم کسانوں کو چھٹی نہ ملے نہیں جناب ہم کسان لوگ کبھی اتوار کو کام نہیں کریں گے!"

اتنا کہہ کر مرغ باز چاچا جلدی سے وہاں سے کھسک لئے۔ دلیپ کو غصہ تو بہت آیا۔ مگر اس نے اپنے غصے کو پی لیا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ان لوگوں کو راہ راست پر لانے کے لئے بڑے صبر اور عرصے کی ضرورت ہے اپنا پتہ مارنا ہوگا۔ جبھی یہ لوگ ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ غصہ کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس لئے اس نے اپنے غصے کو اچھی طرح سے پی لیا اور اپنے چہرے پر مسکراہٹ لا کر اس چھپّر کے نیچے گیا جہاں پتنگ باز پرتھوی راج پچّوں کی لین ڈوری کے ساتھ پتنگ ڈور، مانجھے اور چرخی میں مصروف تھے۔ اور جا کر کہنے لگا بڑی نرمی سے۔

"بھیّا۔ میں آپ کو بیلوں کے لئے چھپّر باندھنے کو کہہ گیا تھا۔"

"اماں یار۔ تم بھی غضب کرتے ہو" پرتھوی راج تنک کر بولا۔ "ابھی تو میں

پتنگ کا مانجھا لگانے سے فارغ نہیں ہوا ہوں۔ پھر کیسے لگا دوں گا؟"

"تو مانجھے سے فارغ ہو کر چھپر باندھ دیجئے!"

"مانجھے سے فارغ ہو کر تو میں پتنگ بناؤں گا!"

"تو پتنگ بنانے میں کونسی صدیاں لگ جائیں گی۔" دلیپ نے جواب دیا "ایک کاغذ چاہیئے اور دو لکڑی کی کھپچیاں۔ دو منٹ کا نام ہے!"

"میاں تم کام کی نزاکت کو سمجھتے نہیں ہو۔" پتھوی راج بولا۔ "اناڑی جو ٹھہرے۔ تمہیں کیا معلوم کہ پتنگ محض کاغذ اور لکڑی کی کھپچی کا نام نہیں ہے۔ ایک پتنگ میں کانپ ہوتا ہے۔ ٹھڈا ہوتا ہے۔ پنّا ہوتا ہے۔ کنّی ہوتی ہے۔ بکا ہوتا ہے۔ پن چھلا ہوتا ہے۔ صبح سے شام ہو جاتی ہے۔ جب کہیں جا کر ایک اچھی پتنگ تیار ہوتی ہے۔!"

دلیپ وہاں سے مایوس ہو کر بڑے ٹھاکر کے پاس پہنچا تو وہ موہن سنگھ کے ساتھ شطرنج کھیل رہے تھے اور جب دلیپ کو معلوم ہوا کہ کن کوالیفکیشن کے بوتے پر موہن سنگھ کو رکھا گیا تو وہ بے حد خفا ہو کر بولا۔ "مگر تایا جی ہمیں شطرنج کا کھلاڑی نہیں۔ کھیتی باڑی کا کام کرنے والا چاہیئے۔"

بڑے ٹھاکر نے کہا۔ "وہ بھی کرے گا۔ وہ بھی کرلے گا۔ جو آدمی شطرنج کی چال اتنی اچھی چلتا ہو اس کے لئے کھیتی باڑی کیا مشکل ہے؟"

دلیپ نے کہا۔ "ان کی چال تو میں ابھی دیکھ لیتا ہوں۔" پھر وہ موہن سنگھ سے مخاطب ہوا۔ "ذرا آؤ میرے ساتھ!"

موہن سنگھ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور دلیپ اسے کھیتوں میں لے گیا۔ اور اس کے ہاتھ میں درانتی دے کر بولا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"موہن سنگھ!"

"تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟"

"ماں تو مر چکی ہے۔ باپ شوگر فیکٹری میں کام کرتا ہے۔"

"تم نے کہاں تک پڑھا ہے؟"

"میٹرک پاس ہوں!"

"تو شوگر مل ہیں نوکری کیوں نہیں کر لی؟"

"وہاں مجھے کوئی نوکری نہیں ملی۔"

"ہوں۔" کہہ کر دلیپ سوچ میں پڑ گیا۔ موہن سنگھ کو ایسا معلوم ہوا جیسے دلیپ اسے کام سے انکار کرنے والا ہے۔ اس لئے اس نے بڑی عاجزی سے کہا۔ "سچ بات یہ ہے کہ میں مل میں کام نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے کھیتی باڑی کا بہت شوق ہے۔ میں نے یہ کام کبھی نہیں کیا ہے لیکن شوق بہت ہے۔ مجھے کھلے آسمان تلے کھلی ہوا میں کام کرنے کا شوق ہے۔ دل سے میں ایک کسان ہوں۔ کام نہیں جانتا لیکن سیکھ جاؤں گا اور جب تک نہ سیکھوں گا آپ مجھے ایک پیسہ مت دیجئے!"

دلیپ نے تیز نگاہوں سے موہن کی طرف دیکھا۔ اسے اس نوجوان کا معصوم اور پرخلوص اور پر اعتماد لہجہ پسند آیا۔ ابھی چند لمحے پہلے وہ اسے صاف جواب دینے کی سوچ رہا تھا لیکن اس کی باتیں سن کر اس کا دل پگھل گیا اور اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور دل ہی دل میں تجربے کے طور پر چند ماہ موہن سنگھ کو اپنے ساتھ رکھنے پر تیار ہو گیا۔ اس نے ایک درانتی خود اٹھائی اور موہن سنگھ کو اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "آؤ۔ کام کرو۔ میرے ساتھ ان مینڈھوں پر اگی ہوئی گھاس کاٹو۔!"

"گھاس ؟"

"ہاں۔ لوگ کہتے ہیں گھاس کاٹنا بہت آسان کام ہے۔ لیکن دراصل یہ بہت مشکل کام ہے۔ سب سے پہلے درانتی پکڑنا سیکھو۔ پھر گھاس کے خوشے پکڑنا سیکھو پھر درانتی سے گھاس کاٹنا۔ پھر گھاس کاٹ کر گٹھا بنانا۔ اس کام کے چار مرحلے ہیں چاروں تمہیں سیکھنا ہوں گے !"

موہن سنگھ دلیپ کے قریب بیٹھ گیا اور دلیپ اسے سکھانے لگا۔

موہن سنگھ ایک عمدہ شاگرد ثابت ہوا۔ بہت جلد اس نے گھاس کاٹنا سیکھ لیا اور پھر دلیپ اور موہن دونوں اکڑوں بیٹھ کر گھاس کاٹنے لگے۔

تھوڑی دیر کے بعد موہن سنگھ کے منہ سے زور کی ایک چیخ نکل گئی۔

دلیپ نے گھاس کاٹتے کاٹتے اپنا ہات روک کر پوچھا۔ "کیا ہوا ؟"

موہن سنگھ سر جھکا کے خاموش ہو گیا۔ اس کی انگلی کٹ گئی تھی اور اس کے ہات سے خون نکل کر گھاس پر بہہ رہا تھا۔ دلیپ نے اپنی درانتی پھینک دی اور پیچھے مڑ کر موہن کا ہات پکڑ کر اسے اونچا کیا اور بہتے ہوئے لہو کو دیکھ کر بولا۔ "ارے۔ رے انگلی کٹ گئی۔"

موہن کی آنکھوں میں آنسو آگئے اپنے ہونٹ دانتوں سے چباتے ہوئے بولا۔ "بہت درد ہوتا ہے !"

دلیپ نے موہن کے ہات کو چھوتے ہوئے کہا۔ "یہ ہات تمہارے کتنے ملائم اور نرم ہیں۔ سردار جی ! معلوم ہوتا ہے جیسے زندگی بھر ان ہاتوں نے کبھی کوئی سخت کام ہی نہیں کیا ہے ؟"

موہن سنگھ روہانسا ہو کر بولا۔ "ایک تو ہماری انگلی کٹ گئی ہے اس پر آپ مذاق کرتے ہیں۔ !"

دساری۔" دلیپ سنجیدہ ہو کر بولا۔" ٹھہرو۔ میں تمہارے لئے دوا لاتا ہوں!"
تھوڑی دیر کے بعد دلیپ دوا اور پٹی لے کر آیا اور اس نے موہن سنگھ کی انگلی صاف کر کے اس پر دوا لگا کر اس پر پٹی باندھنے لگا۔ پٹی باندھتے باندھتے وہ کہتا جاتا تھا۔" آج کل ہمارے دیش میں نرم اور گیگلے نوجوان کی ایک نئی نسل تیار ہو رہی ہے جو گوشت اور ہڈی کے بجائے اسپنج کے بنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں یہ لوگ راک این رول کے سوا زندگی کا اور کوئی فن نہیں جانتے!"
"مجھے راک این رول سے نفرت ہے۔" موہن سنگھ بولا۔" اور مجھے ایسے عام نوجوانوں سے نفرت ہے اور میں تمہیں چند روز کے بعد کام سیکھ کے بتا دوں گا کہ میں کیسا نوجوان ہوں۔ مجھے موقع دو دلیپ بابو!"

اسی رات کو سندھیا اور اس کا باپ ڈائننگ روم میں بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے تو سیٹھ دھنپت رائے نے سندھیا کے ہات پر پٹی بندھی دیکھ کر پوچھا۔" تمہاری انگلی کو کیا ہوا؟"
سندھیا بولی۔" پتاجی۔ میں پاس کے ایک گاؤں میں تصویر بنانے کیلئے گئی ہوئی تھی۔ وہیں اس انگلی میں ایک کانٹا چبھ گیا!"
سیٹھ نے سوپ پلیٹ میں چمچہ ڈالتے ہوئے کہا۔" کانٹوں سے نہیں کھیلا کرتے بیٹی!"
کچھ سوچ کر سندھیا کے گال سرخ ہو گئے۔ مگر وہ منہ سے کچھ نہیں بولی

سر جھکا کر کھانا کھانے لگی۔

شاعر نے لقمہ توڑتے ہوئے مصور سے کہا۔ "ہر روز وہی دال روٹی۔ وہی دال روٹی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔؟"

گجیندر سنگھ بولا۔ "کسان ہر روز یہی کھاتا تھا۔ ۔ ۔!"

ٹھاکر لوکیندر سنگھ مسکین نے کھانا پرے ہٹاتے ہوئے غصے سے کہا۔

"اب ہم سے یہ کھانا نہیں کھایا جاتا!"

گجیندر سنگھ نے کہا۔ "زمینداری ختم ہوگئی۔ مگر آپ کی پرانی عادتیں ختم نہیں ہوئیں اب تو یہی دال روٹی کھانا پڑے گی۔ کیونکہ کسان ہر روز یہی کھاتا تھا۔!"

مسکین غصے سے بولے۔ "کھاتا ہوگا صاحب۔ مگر آج کا کسان وہ پرانا کسان نہیں رہا۔ وہ بدل چکا ہے۔ آج کا کسان بھی اپنا حق مانگتا ہے۔ اب وہ دال روٹی پر قناعت نہیں کرے گا۔ اسے چاہیئے بیبنی روٹی، خستہ نان، شاہی کباب، بھنا ہوا مرغ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

یکایک شاعر چاچا بولتے بولتے چپ ہوگئے۔ کیونکہ عین اسی وقت ان کی نگاہوں کے سامنے سے جرنیل چاچا کا "رستم ہند" گردن پھلائے کڑکڑاتا ہوا ان کے سامنے سے گذر گیا۔ ایک لمحہ کے لئے شاعر چاچا نے مرغ سے نظر ہٹا کر گجیندر سنگھ کی طرف دیکھا اور عین اسی لمحہ ایک ہی خیال ان دونوں کے دل

میں گذرا اور وہ ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھ کر مسکرا دیئے۔
دوسرے لمحے میں مصوّر نے بھی اپنا کھانا پرے ہٹا دیا اور بولا۔

"آج سے دال روٹی بند!"

پھر وہ دونوں ایک ساتھ اٹھے اور مرغے کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ مرغ نے جیسے ان کا عندیہ بھانپ لیا۔ اس لئے وہ بڑی تیزی سے اور زیادہ شدّت سے کڑکڑاتا ہوا آگے آگے چلنے لگا۔ گجیندر سنگھ نے تیزی سے دوڑ کر اس پر جھپٹّا جو مارا تو مرغ وحشیانہ انداز میں کڑکڑا کر اڑا اور ایک باڑھ کے پیچھے غائب ہو گیا۔

مسکینؔ نے گجیندر سے کہا۔ "بھتیجے اس طرح سے مرغ قابو میں نہیں آئے گا!"

گجیندر نے پوچھا۔ "پھر کیا کریں۔؟"

"مرغ کو دانہ ڈالو، اور جب وہ دانہ چگنے میں مصروف ہو تو۔ بڑھ کر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !"

"سمجھ گیا۔" گجیندر نے خوش ہو کر کہا۔ "میں کہیں سے دانہ لاتا ہوں۔ آپ ذرا رستم ہند کو نظر میں رکھیئے۔!"

چند منٹ کے بعد گجیندر ایک مٹھی بھر دانہ لے کر لوٹ آیا اور وہ دونوں دبک دبک کر باڑھ کی اوٹ میں آگے بڑھے۔

"آ۔ آ۔ آ۔ آ۔" گجیندر سنگھ نے مرغ کو دانہ دکھاتے ہوئے اپنے پاس بلایا۔ مگر رستم ہند نہایت ہی چالاک مرغ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اپنی چونچ ہلا کر تین بار انکار میں سر ہلایا بھی اور نگاہیں چرا کر گجیندر سنگھ کی بند مٹھی کی طرف بھی دیکھنے لگا۔!

"آ۔ آ۔ آ۔" شاعر چاچا بولے۔ "بڑا پیارا مرغ ہے اپنا رستم ہند!"
گجیندر سنگھ نے مٹھی کھول کر دانہ مرغ کے آگے پھینکا۔
رستم ہند پلٹ کر دانا ٹھونگنے لگا۔ مگر دانہ چگتے چگتے۔ بیچ بیچ میں سر اٹھا کر دیکھ لیتا تھا کہ اس کے اور ان دونوں ٹھاکروں کے درمیان کتنا فاصلہ ہے۔
گجیندر سنگھ اور لوگیندر سنگھ دبے پاؤں بڑی ہوشیاری سے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔
مرغ دانہ چگتے چگتے کڑکڑاتا رہا اور اپنے پروں کو بار بار پھلا کر خطرے کے ہلکے سے امکان پر بھی اڑنے کے لئے تیار ہوتا رہا۔ گجیندر سنگھ نے اسے اور دانہ پھینکا اور مسکین صاحب مرغ کی تالیفِ قلب کے لئے کہنے لگے۔
"رستم ہند تو اپنا بیٹا ہے جی۔ بڑی جلدی میری گود میں آجاتا ہے۔ آ۔ آ۔ آ۔" کہہ کے شاعر چاچا آگے بڑھنے۔ کیونکہ اب ان سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ اور مرغ دیکھ کر ان کی رال ٹپکنے لگی تھی۔ آگے بڑھ کر انہوں نے زور کا ایک جھپٹا جو مارا تو رستم ہند ان کے ہاتھوں میں سے نکل گیا اور زور سے شور مچاتا ہوا اڑتا ہوا ایک جھاڑی کے دوسری طرف چلا گیا اور شاعر چاچا کے ہاتھ میں مرغ کے صرف دو پر رہ گئے۔
"دھت تیرے کی۔" شاعر چاچا نے غصّے سے پروں کو پھینکتے ہوئے کہا۔
"مرغ خبردار ہو چکا ہے۔" گجیندر نے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر شاعر چاچا سے سرگوشی میں کہا۔ "اتنی آسانی سے نہیں جائے گا!"
"پھر کیا کریں؟"
گجیندر نے پلان بنایا۔ "آپ دائیں طرف سے دوزانو ہو کر زمین پر گھسٹے ہوئے جھاڑی کی طرف چلیں۔ میں بائیں طرف سے آتا ہوں۔ مگر بالکل زمین

سے لگ کر گھسٹ کر چلئے۔ اگر مرغ کی نظر پڑ گئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !"

شاعر چاچا نے دانت پیس کر کہا "سائے کو کچا ہی کھا جاؤں گا!"

"پہلے ہاتھ تو آجائے۔!"

اب وہ دونوں گھٹنوں کے بل زمین پر چار پایوں کی طرح چلنے لگے دبک دبک کر اور آہستہ آہستہ جھاڑی کی طرف بڑھنے لگے۔ راستے میں چبھنے والے سنگریزے اور نوکیلے کنکر اور چھوٹی چھوٹی خار دار جھاڑیوں کے کانٹے انھیں چبھتے گئے۔ گھٹنے چھل گئے۔ دو ایک جگہ سے کپڑے بھی پھٹ گئے اور ہاتھ اور پاؤں میں بھی کانٹے چبھ گئے۔ مگر اب شاہی خون جوش میں آچکا تھا اور اس لئے وہ دونوں پسینے میں تر بتر دانت پیستے ہوئے غصے سے کھولتے ہوئے آگے بڑھتے ہی چلے گئے اور بڑی جھاڑی کے قریب پہنچ کر جہاں مرغ چھپا بیٹھا تھا وہ دونوں دفعتاً اٹھے اور مرغ پر لپکے۔

مرغ زور سے چیخ مار کر اوپر ہوا میں اچھلا اور عین اسی وقت جھاڑی کے پیچھے سے جرنیل چاچا نمودار ہوئے اور انہوں نے رستم ہند کو اپنے ہاتھوں میں دبوچ لیا۔ مرغ دیر تک اپنے مالک کی باہوں میں کڑ کڑ اتا رہا گویا گجیندر سنگھ اور مسکین صاحب کی شکایت کر رہا ہو۔!

جرنیل چاچا نے ان دونوں کو غضب ناک نگاہوں سے دیکھا۔ اور گرج کر بولے "خبر دار جو کبھی میرے رستم ہند کو ہاتھ لگایا۔ تم دونوں کو مرغا بنا دوں گا۔"

ان دونوں نے کچھ نہیں کہا۔ ایک لحظہ کے لئے ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھا جس پر گہری مایوسی کی جھلک تھی۔ ان کے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ گھٹنوں سے خون بہہ رہا تھا۔ ہاتھوں میں کانٹوں چبھ گئے تھے۔ سانس پھول گئی تھی اور ماتھے سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ وہ کچھ کہے بغیر مایوسی سے پلٹ گئے اور آہستہ آہستہ ساتھ

ساتھ چلنے لگے!

مسکین صاحب نے سر جھٹک کر کہا۔ "اقبال نے کہا ہے ۔ تیری دنیا جہاں مرغ و ماہی!"

"بالکل غلط کہا ہے۔ کدھر ہے مرغ و ماہی؟ ۔ جدھر دیکھو دال، روٹی، دال، روٹی۔!"

گجیندر نے سر ہلا کر کہا۔ "اب تو وہ ہماری دال روٹی بھی چیل کوّے کھا گئے ہوں گے۔!"

وہ دونوں مایوس ہو کر اسی طرح سر جھکائے چلے جا رہے تھے کہ یکایک انہیں زنانہ چھپر کے پیچھے جامن کے پیڑوں کے جھنڈ میں چڑیوں والے چاچا جی کے پنجرے لٹکتے نظر آئے۔ خوبصورت طوطے اور کبوتر اور تیتر اور چکور اور بھرے بھرے جسموں والی خوبصورت چڑیاں پھدکتی اور چہکتی ہوئی ۔۔۔۔!

چند لمحوں کے لئے وہ دونوں مبہوت ہو کر ان پنجروں کو دیکھتے رہے بدقت تمام وہ اپنی نظریں ان پرندوں سے ہٹا سکے۔ پھر ان دونوں نے پلٹ کر ایک دوسرے کو دیکھا اور آہستہ آہستہ ان دونوں کے مایوس چہروں پر ایک لذیذ مسکراہٹ ابھرنے لگی۔

رات کے وقت جب سب ٹھاکر بھائی زمین پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگے تو چٹخارے لے لے کر سالن کی تعریف کرنے لگے۔ جیسے شاعر چاچا اور گجیندر

نے مل کر تیار کیا تھا۔ ایک عرصے کے بعد گھر میں گوشت کا سالن پکا تھا

"واہ۔ واہ۔ واہ۔" بڑے ٹھاکر جھوم کر بولے "مزہ آگیا۔ ایک عرصے کے بعد بٹیر کھانے کو ملے ہیں۔!"

"اور اس تیتر کا تو جواب نہیں ہے۔" چڑیوں والے چاچا بہک کر بولے۔

"ذرا یہ کباب بھی تو چکھیئے۔" شاعر چاچا نے ایک کباب چڑیوں والے چاچا کی نظر کرتے ہوئے کہا۔

"ہوں۔ ان بٹیروں کی ہڈیاں تک خستہ ہو گئی ہیں۔" جرنیل چاچا مزہ لے کر بولے۔ "یہ بٹیر کون لایا ہے؟"

گجیندر سنگھ نے کہا۔ "میں اور شاعر چاچا آج سہ پہر میں جنگل کو چلے گئے تھے۔ وہاں سے بٹیر اور تیتر پکڑ کے لائے۔"

"جنگلی ہیں ناں؟" چڑیوں والے چاچا پرندوں کے بارے میں اپنی علمیت کا اظہار کرتے ہوئے بولے۔ "میں تو پہلا لقمہ کھا کر ہی سمجھ گیا تھا۔ کہ جنگلی ہیں۔ جبھی تو ان کی لذت کا جواب نہیں!"

"یہ سالن کس نے پکایا ہے؟" جرنیل چاچا نے پوچھا۔

"بٹیر میں نے پکائے ہیں۔" گجیندر سنگھ بولا۔ "تیتر شاعر چاچا نے تیار کئے ہیں اور کباب ہم دونوں نے مل کر!"

"لطف آگیا۔" چڑیوں والے چاچا چٹخارہ بھر کر بولے۔ "اگلی بار مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ میں بھی کچھ پرندے پکڑ کر لاؤں گا۔"

گجیندر سنگھ نے شاعر چاچا کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اس جگہ تو جتنے پرندے تھے ہم سب پکڑ کے لے آئے۔"

شاعر نے صاد کیا۔ "وہاں اب کچھ نہیں ہے!"

"کوئی مضائقہ نہیں۔" چوڑیوں والے چاچا بولے۔ "کہیں اور چلیں گے۔"
پھر انہوں نے زور کی ایک ڈکار لی اور دونوں ہات اوپر اٹھا کر بولے۔ "ہا۔ اب پیٹ بھر گیا ہے۔ اب بالکل جگہ نہیں ہے اس میں!"
"میں سوچتا ہوں گجیندر۔" شاعر چاچا بولے۔ "یہ دنیا کیسی عجیب ہے ایک جگہ بھرتی ہے تو دوسری جگہ خالی ہو جاتی ہے!"
"ہا ہا ہا۔" چوڑیوں والے چاچا خوش ہو کر ہنسے۔ "تم نے تو سائنٹفک شلسٹر کا سارا فلسفہ ایک فقرے میں بیان کر دیا۔ واہ۔ واہ۔ بھیا۔ میرا خیال ہے تم اس پر ضرور ایک کویتا لکھو!"
پھر اپنی انگلیاں چاٹ کر بولے۔ "اچھا۔ میں جاتا ہوں۔ اپنی چڑیوں کو رات کا چوگا ڈال دوں۔!"
چڑیوں والے چاچا کے جانے کے بعد چند منٹ تک مکمل خاموشی طاری رہی۔ کوئی نہیں بولا۔ سب لوگ اطمینان سے اپنی اپنی تھالیوں میں کھاتے رہے چند منٹ کے بعد زنانہ چھپر کے پچھواڑے سے زور کی ایک چیخ بلند ہوئی۔ سب لوگ گھبرا کر اپنی اپنی تھالی چھوڑ کر ادھر بھاگے۔ جا کے کیا دیکھتے ہیں کہ جامن کے پیڑوں تلے چڑیوں والے چاچا دونوں ہاتوں سے اپنا سر پیٹ رہے ہیں اور بین کر رہے ہیں۔
"ہائے میرا ہیرا من طوطا۔ ہائے میرے لقا کبوتر۔ ہائے میرے چندر مکھ چکور۔ ہائے میں لٹ گیا۔ مر گیا۔ برباد ہو گیا۔"
سب لوگوں نے گھبرا کر اوپر جامن کی طرف دیکھا طرف دیکھا۔
شاخوں پر لٹکتے ہوئے سارے پنجرے خالی پڑے تھے۔

سنگراہا خاندان کے بچے اپنے نکمے ماں باپ کی تقلید میں دن رات آوارہ گھومتے تھے۔ اور اپنے ماں باپ کی دیکھا دیکھی ان کے مشاغل بھی وہی ہو گئے تھے جو ان کے ماں باپ کے تھے۔ موہن سنگھ نے کھیتوں میں کام کرنے کے علاوہ ان بچوں کو پڑھانے کی ڈیوٹی بھی اپنے ذمے لے لی۔ اور دلیپ موہن سنگھ کی اس مستعدی پر بیحد خوش ہوا۔ جب اس نے دیکھا کہ دوسرے دن ہی علی الصبح موہن سنگھ کہیں سے ایک بلیک بورڈ اٹھا لایا ہے اور بچوں کو جمع کر کے اس نے ان کے ہاتھ میں تختیاں دے کر بلیک بورڈ کے سامنے بٹھا دیا ہے اور چاک سے " क " لکھ کر کہہ رہا ہے۔ "یہ " क " ہے۔ کا۔ کا سے کام ہوتا ہے جو بچے کام کرتے ہیں وہ زندگی میں انعام پاتے ہیں۔ اس لئے بولو بچو۔ " क " سے کام؟"

اس پر پرتھوی راج پتنگ باز کا بڑا بیٹا بول اٹھا "کا سے کام نہیں ہوتا ماسٹر جی۔ کنکوا ہوتا ہے۔ جو میرے پتاجی روز اڑاتے ہیں۔"

تو چڑیوں والے چاچا کا بیٹا بولا۔ "جی نہیں۔ کا سے کبوتر ہے۔ میرے پتاجی کے پاس بہت سے کبوتر ہیں۔!"

"جی نہیں۔ کا سے کوِتا ہوتی ہے۔ جو پتاجی لکھتے ہیں!" شاعر چاچا کا لڑکا بول اٹھا۔

"غلط" شرابی مصور کا بیٹا بولا۔ "کا سے کاگ ہوتا ہے۔ شراب کی بوتل کا۔ جو پتاجی روز پیتے ہیں۔"

"اچھا۔ اچھا" موہن سنگھ جلدی سے بولا۔ "شور وغل مت کرو۔ کا سے کنکوا۔ کا سے کبوتر۔ کا سے کوِتا۔ کا سے کارک سہی۔ مگر " क " لکھا اس طرح جاتا ہے جس طرح میں نے اسے بلیک بورڈ پر لکھا ہے۔ اس لئے اب تم سب بچے اس اکچھر کو اپنی تختی پر اسی طرح لکھو۔"

سب بچے क حروف کو اپنی تختیوں پر لکھنے لگے۔ تو اتنے میں موہن سنگھ نے क کے بعد دوسرا اکچھر ख لکھ دیا اور بولا۔ "دیکھو क کے بعد ا ख کھا آتا ہے۔ کھا ख سے کھیت۔ جن پر فصل اگتی ہے۔ یہ سامنے والے کھیت جن کی روٹی ہم سب کھاتے ہیں۔ اس لئے کھا ख سے کھیت ہوتا ہے۔ سمجھ گئے۔؟

سب بچے زور سے بولے۔ "سمجھ گئے۔!"

"کیا سمجھے کھا ख سے کیا ہوتا ہے؟" موہن سنگھ نے پوچھا۔ "جو بچہ سمجھ گیا ہو وہ ہات کھڑا کرے۔!"

بھی بچوں نے ہات کھڑے کر دیئے۔ موہن سنگھ نے مرغ باز تایا کے لڑکے سے پوچھا۔ "اندرجیت تم بتاؤ کھا ख سے کیا ہوتا ہے؟"

کھا بچہ ہوتا ہے ماسٹر جی۔" اندرجیت بولا۔

"کھا بچہ؟" موہن سنگھ نے حیران ہو کر پوچھا۔ "کھا بچہ کیا ہوتا ہے؟"

"کھا بچہ وہ ہوتا ہے جس میں مرغ کو بند کرتے ہیں۔!"

اس پر فوراً دوسرا لڑکا اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "کھا سے کھیرا کبوتر ہوتا ہے جو سبد ھا اوپر کو اڑتا ہے۔"

"غلط۔ کھا سے کھمبم ہوتی ہے" پرتھوی راج کے بیٹے شام سنگھ نے جواب دیا۔

"کھمبم کیا ہوتی ہے؟" موہن سنگھ نے شام سنگھ سے پوچھا۔

"لو۔ ماسٹر جی کو یہ بھی معلوم نہیں کھمبم کیا ہوتی ہے؟" شام سنگھ نے مڑ کر اپنے دوستوں سے کہا اور سارے لڑکے لڑکیاں ہنس پڑے۔ پھر شام سنگھ نے بڑے

فخر اور غرور سے مڑ کر ماسٹر جی سے کہنے لگا۔

"اجی ماسٹر جی۔ کھمّم اڑتی ہوئی پتنگ کی کھنچائی کو کہتے ہیں۔ ایسے۔ ۔ ۔ ایسے۔ ۔ ۔" شام سنگھ ہات کے اشارے سے کھنچائی کر کے کھمّم کے معنی بتلانے لگا

موہن سنگھ کو پسینہ آگیا۔ وہ جلدی سے رومال نکال کر اپنا پسینہ پونچھ کر کسی قدر کڑے لہجہ میں بولا۔

"نہیں۔ کھاسے نہ کھانچہ۔ نہ کھیرا۔ نہ کھمّم رسب کھول جاؤ۔ یاد رکھو کھا سے کھیت ہوتا ہے۔ کھیت۔ لکھو۔ ۔ ۔!"

سب بچے اپنی اپنی تختیوں پر جھک کر لکھنے لگے۔ دلیپ مسکرا کر وہاں سے چلا گیا۔ ان شیطان کے بچوں کو قابو میں لانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ لیکن جس تندہی اور خلوص سے موہن سنگھ کام کر رہا تھا اس سے اسے یقین ہو چلا تھا کہ اگر موہن سنگھ نے اس طرف برابر توجّہ دی تو وہ دو چار دن میں تو نہیں لیکن دو چار ماہ میں ان بچوں کو سیدھے راستے پر لانے میں کامیاب ہو جائے گا۔!

لیکن اصل مسئلہ ان بچوں کا نہیں ان بچوں کے ماں باپ کو ٹھیک کرنے کا تھا عمر کے ساتھ ساتھ ان کی عادتیں اتنی پختہ ہو چکی تھیں کہ انھیں اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کے سب تجربے ناکام رہے تھے۔ عاجز آکر دلیپ نے پالن گڈھ کے دوسرے کسانوں سے بات چیت کر لی۔ اور انہیں اپنے فارم کی فصل کا آدھا حصّہ دینے کا وعدہ کر کے انہیں فارم کی زمین پر گنّا اگانے کے لئے تیار کر لیا۔ گاؤں کے کسان اپنی اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کے بعد فارم پر آکر بھی کام کرنے لگے۔ کسانوں کو کام پر جٹے دیکھ کر خاندان کے دوسرے ٹھاکروں کو بالکل اطمینان ہو گیا اور وہ اپنی گذشتہ زندگی کے دھرّے پر چلنے لگے۔ کام کاج سے انہوں نے بالکل ہات کھینچ لیا اور اِدھر دلیپ نے بھی ان کی سستی اور کاہلی دیکھ کر انہیں

کہنا سننا چھوڑ دیا۔ اور اپنے کام میں لگ گیا۔ دھیرے دھیرے کھیتوں میں فصل سر اٹھانے لگی۔ اور سبزہ چاروں طرف پھیلنے لگا۔ اور دلیپ کا دل خوشی سے مسحور ہونے لگا۔ اس کی آنکھوں میں امید جھلکنے لگی۔ اگر اسی طرح کام ہوتا رہا تو آہستہ آہستہ چند سالوں میں وہ سارے قرضے چکا دے گا۔ اور اپنے پرکھوں کی گروی رکھی ہوئی حویلی واپس لے لیگا اور سنگرا ہا خاندان کے دن پھر جائیں گے۔ اور ان لوگوں کو پھر سے فراغت اور آسائش نصیب ہو گی۔ کسی کے خون میں نہائی ہوئی فراغت نہیں بلکہ اپنے دست و بازو سے حاصل کی ہوئی آسائش۔

موہن ہر وقت اس کے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ اب وہ اپنے کام میں خاصہ ہوشیار ہو گیا تھا۔ کسانوں کی سی طاقت تو اس کے جسم میں نہ تھی اور نہ ہی وہ تجربہ اسے حاصل تھا لیکن اس کے انہماک اور کام کی لگن دیکھ کر دلیپ بہت خوش ہوتا تھا۔ اور ہر وقت اسے اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ کبھی کبھی اپنے دل کے سپنے اس سے بیان کرتا۔ کبھی اسے کھیتوں سے پرے اپنی حویلی کے پیچھے اونچے اونچے ٹیلوں کے نیچے بہتی ہوئی ندی کے کنارے لے جاتا اور موہن سنگھ سے کہتا۔

"ایک دن میں اس ندی سے ایک نہر نکالوں گا اور اپنے فارم میں لے آؤنگا پھر ہم موسم کی عشوہ طرازیوں سے بچ جائیں گے اور دھن تال سے پانی لے کر پانی کا ٹیکس دینے پر مجبور نہ ہوں گے۔ اس نہر کو کاٹنا میری زندگی کا سب سے بڑا خواب ہے۔!"

موہن سنگھ نے کہا۔ "ایک نہر فرہاد نے بھی کاٹی تھی!"

دلیپ دیر تک چپ رہا۔ پھر وہ منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا اور آہستہ سے بولا۔

"میرے پاس محبت کے لئے کوئی وقت نہیں ہے!"

موہن سنگھ نے کہا۔ "محبت کا کوئی وقت نہیں ہوتا!"

دلیپ نے ایکدم گھوم کر اپنا ہات موہن سنگھ کے شانے پر رکھ دیا اور تیز لہجہ میں بولا۔" محبت کی فصل اگانے کے لیئے اتنا ہی وقت چاہیئے جتنا محبت کی فصل کاٹنے کے لیئے اور میں ان دونوں میں سے صرف ایک کو وقت دے سکتا ہوں۔"

پھر وہ چند لمحوں کی تکلیف دہ خاموشی کے ساتھ بولا۔" موہن سنگھ کھلے آسمان میں گھومتے ہوئے سپید بادلوں کو دیکھ کر کس کا جی محبت کرنے کو نہیں چاہتا؟ سبز اور نیلے پنکھوں والے ماہی گیر کو ندی کی چنچل لہروں پر مچلتے کس کا جی محبت سے چھلکتی ہوئی آنکھوں میں ڈوب جانے کو نہیں چاہتا۔ لیکن زندگی کی ذمہ داریاں محبت کی ذمے داری سے بہت بڑی ہے۔ تم ابھی بچے ہو، نہیں سمجھ سکو گے۔"

یکایک دلیپ چپ ہو گیا۔ اس کا پریشان اور متفکر چہرہ دیکھ کر موہن سنگھ کو اس پر بہت ترس آیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ دلیپ کے سر کو جھکا کر اسے اپنے سینے پر رکھ لے اور اس کے پریشان بالوں میں انگلیاں دھیرے دھیرے پھیرے۔ مگر وہ چپ رہا۔ اور جب دلیپ چند لمحوں کے توقف کے بعد کھیتوں کی طرف واپس لوٹا تو وہ بھی اس کے قدموں کے پیچھے پیچھے خاموش ہو کر چلتا گیا۔ اور چلتے چلتے ایک عجیب سی اداسی اور تھکن سے اس کے قدم بھاری ہو گئے۔

ایک روز موہن سنگھ نے ایک دن کے لیئے فارم سے چھٹی لی۔ ہوا یہ کہ سیٹھ دھنپت نے اپنے دوست سیٹھ جیون لال کے لڑکے من موہن کو سندھیا کے لیئے پسند کر لیا اور بات بھی پکی کر لی اور جب اس نے ٹھونک بجا کر اچھی طرح اطمینان کر لیا تو اس نے سیٹھ جیون لال اور من موہن کی اپنے گھر پہ دعوت کی۔ اس دعوت کے لیئے اس نے سیٹھ جیون لال اور اس کے لڑکے کو کانپور سے بلایا تھا اس لیئے اس موقع پر سندھیا کی موجودگی بے حد ضروری تھی۔

سیٹھ دھنپت رائے نے اپنی بیٹی سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی تھی

اس کا ارادہ اس دعوت کے بعد بات چیت کرنے کا تھا۔ لیکن سندھیا باپ کا عندیہ بھانپ چکی تھی۔ گو بظاہر لاعلم نظر آتی تھی۔ من موہن اسے بے حد شریف اور عمدہ نوجوان نظر آیا۔ دیکھنے میں بھی اچھا تھا۔ بات چیت کرنے میں بھی۔ اس کے باپ کی کانپور میں تین ملیں تھیں اور چلاس کے مقام پر شراب بنانے کا ایک کارخانہ تھا۔ جس کے مال کی کھپت شراب بندی قانون کے باوجود اسکی وجہ سے ہر سال بڑھتی جاتی تھی۔ منموہن بھی اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جس طرح اپنے باپ کی اکلوتی لڑکی تھی۔ ہر لحاظ سے یہ رشتہ عمدہ اور مناسب نظر آتا تھا۔

دعوت بے حد کامیاب رہی۔ خاص اس موقع کے لئے سیٹھ دھنپت رائے نے لکھنؤ سے دو باورچی بلوائے تھے۔ جو مغلئی کھانوں کے ماہر سمجھے جاتے تھے اور چونکہ سیٹھ جیون لال اور ان کے بیٹے منموہن کو بھی عمدہ کھانوں کا بہت شوق تھا۔ لکھنؤ کے باورچیوں کے ملائی کباب، استنبولی قورمہ، زعفرانی تکّے اور چار سو ادبہت پسند کئے گئے۔ پینے کے لئے اسپین اور فرانس کی نایاب شرابیں تھیں اور گفتگو کا موضوع شکر کے بھاؤ سے ریان اور ٹیری لین کے صنعتی دھاگوں سے چمڑے کے جوتوں تک بدلتا رہا۔ کیونکہ سیٹھ جیون لال کو مشرقی یورپ کے ایک ملک میں بیس لاکھ جوتے سپلائی کرنے کا آرڈر ملا تھا اور اس آرڈر کی تکمیل کے لئے آگرہ میں جوتوں کی ایک فیکٹری کھولنے کی بے حد ضرورت تھی۔ غرضیکہ بے حد دلچسپ اور پرلطف گفتگو رہی۔ جو سندھیا کے لئے بے حد سبق آموز بھی تھی۔

ان لوگوں کے چلے جانے کے بعد تیسرے پہر کی چائے پر باپ نے بیٹی سے اصل موضوع پر بات کی تو سندھیا نے صاف انکار کرنا ہی مناسب جانا۔ سیٹھ دھنپت رائے کو اپنی بیٹی کے ردّ عمل پر بڑی حیرت ہوئی وہ سمجھ ہی نہ سکا کہ سندھیا کو کیا ہو گیا ہے۔

"سیٹھ جیون لال کا خاندان کانپور کا سب سے اونچا خاندان ہے۔ وہ لوگ اربوں کی جائیداد کے مالک ہیں!"

"میرا باپ بھی ایک کروڑپتی ہے!" سندھیا نے جواب دیا۔

"لڑکا اچھا ہے۔ شریف ہے۔ پڑھا لکھا اور عقلمند ہے!"

"ہاں۔" سندھیا نے اقرار کیا۔ "میرے خیال میں وہ تقریباً ایک فرشتہ ہے۔ لیکن جس دن میں ایک فرشتے سے شادی کرنے پر تیار ہو جاؤں گی۔ آپ کو ضرور مطلع کر دوں گی!"

"خوبصورت بھی ہے!"

"ہاں۔ بالکل کھانڈ کا بنا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ بالکل لالی پاپ معلوم ہوتا ہے۔" سندھیا نے سر ہلا کر کہا۔ "اسے دیکھتے ہی جی چاہتا ہے کہ اسے منہ میں ڈال لیا جائے!"

سیٹھ دھن پت رائے حیرت سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھنے لگے۔ کیا یہ ان کی بیٹی تھی۔ تیرہ سال کی معصوم شرمیلی بچی جسے اس نے مغربی یورپ میں مزید تعلیم کے لئے بھیجا تھا؟ یہ تو کوئی دوسری ہی لڑکی تھی۔ کسی دوسری ہی زمین کی پیداوار۔

اس نے جھلا کر کہا۔ "آخر تم منوہن میں کیا خرابی دیکھتی ہو؟"

"کوئی خرابی نہیں دیکھتی۔"

"کیا برائی ہے اس میں؟"

"کوئی برائی نہیں یہی تو بڑی بات ہے۔" سندھیا اپنا مفہوم واضح کرتے ہوئے بولی۔ "مجھے بڑے آدمی پسند ہیں۔ کڑوے اور تیکھے اور کھردرے جو کبھی کبھی دو ہاتھ بھی لگا دیا کریں تو مضائقہ نہ ہوگا — !"

"کیسی باتیں کرتی ہو تم؟"

"کچھ نہیں صرف اپنی پسند بیان کر رہی ہوں!"

"تو کیا تم من موہن سے شادی نہیں کرو گی؟" اس کا باپ غصّے سے تقریباً چلاّ پڑا۔ "مجھے معلوم نہ تھا۔ میں نے تو سب کچھ تقریباً طے کر لیا تھا!"

"میں ہرگز ہرگز منموہن سے شادی نہیں کروں گی!"

"کیا تمہیں معلوم ہے؟" اس کا باپ اپنے ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔ "ہماری مل سے تین چوتھائی مولاس ان کے شراب کے کارخانے کو سپلائی ہوتا ہے۔ ہر سال لاکھوں کا منافع ہمیں ان کے کارخانے سے ہوتا ہے!"

"تو گویا آپ ایک کارخانے کی شادی دوسرے کارخانے سے چاہتے ہیں۔ نہ کہ ایک انسان کی دوسرے انسان سے" سندھیا سنجیدہ لہجہ میں بولی۔ "مجھے بہت افسوس ہے پتاجی۔ میں مولاس کی ڈھیری نہیں ہوں۔ لڑکی ہوں!"

اتنا کہہ کر سندھیا اپنی آنکھوں میں آنسو چھپائے تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اور اس کا باپ ایرانی غالیچے پہ قدم جمائے سگار کی راکھ جھاڑتا ہکا بکا کھڑے کا کھڑا رہ گیا!

اپنی اسٹڈی میں جا کر سندھیا نے رنگوں کے ڈبّے۔ برش۔ ایزل اور مصوّری کا دیگر سامان اٹھایا۔ گیراج سے گاڑی نکالی اور ساٹھ میل کی رفتار سے باہر سڑک پہ چلی گئی۔ تصویر بنانے میں وقت اچھا کٹ جاتا ہے اور دھیرے دھیرے دل کا دکھ بھی دور ہونے لگتا ہے۔

چند میل جا کر اسے اپنی گاڑی روک دینا پڑی۔ اس پرانے گڈھے میں جو اب بہت بڑا ہو گیا تھا ایک کسان کا چھکڑا دھنس گیا تھا اور کسان سر جھکائے دونوں ہاتھوں سے چھکڑے کو آگے دھکیلنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ گاڑی کی آواز پہ دہ کسان چونکا اور سر اٹھا کر سندھیا کو دیکھنے لگا اور اگلے چند لمحے

سندھیا پر عجیب گومگوں کی حالت میں گذرے۔ مگر اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ دلیپ نے اسے نہیں پہچانا!

دلیپ نے سر اٹھا کر چند لمحوں کے لئے اس کی طرف دیکھا۔ پھر بڑے اطمینان سے کمر سیدھی کر کے کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "میم صاحب! جب تک میرا چھکڑا اس گڈھے سے باہر نہیں نکلے گا تمہاری موٹر بھی آگے نہیں جا سکتی!"

سندھیا کو اس کا تمسخر آمیز لہجہ بالکل پسند نہیں آیا۔ جھنجلا کر سوچنے لگی "یہ کمبخت مجھے پہچاننے تک کی کوشش نہیں کرتا۔ ایک بیل کی طرح اپنی ہی دھن میں اپنے ہی کام میں مگن چلا جاتا ہے۔ اس کے لئے موہن سنگھ بھی کچھ نہیں اور سندھیا بھی کچھ نہیں اور اگر وہ دونوں ایک بھی ہوں تو بھی کچھ نہیں۔ اسے صرف اپنے کام اور اپنے کھیتوں سے مطلب ہے۔ گدھا۔ بیل!" سندھیا نے دل ہی دل میں کہا۔ پھر بلند آواز میں بولی۔" اوہ۔ کہاں بیچ سڑک میں لا کے تم نے اپنے چھکڑے کو پھنسایا ہے۔!"

"میں نے پھنسایا ہے؟" دلیپ حیرت سے بولا۔ "کل کو تم کہو گی یہ سڑک کا گڈھا بھی میں نے کھودا ہے؟"

"تم نے نہیں تمہارے بیلوں نے کھودا ہوگا۔" سندھیا کے منہ سے نکلا۔ اور وہ اندر ہی اندر من میں سوچنے لگی۔ یہ کیوں ہمیشہ مجھ سے لڑتا ہے۔ میں ہمیشہ کیوں اس سے ڈرتی ہوں۔ یہ اس طرح تضحیک بھری نگاہوں سے مجھے کیوں دیکھتا ہے؟ کیا سمجھتا ہے میں کون ہوں؟ اس کی زر خرید لونڈی ہوں، یا غلام ہوں؟ پھر وہ بلند آواز میں بولی۔" اگر اس سڑک پر کسانوں کی بیل گاڑیاں چلنا بند ہو جائیں تو یہاں ایک گڈھا تک نظر نہ آئے!"

دلیپ نے کہا۔" اگر اس سڑک پر کسانوں کی بیل گاڑیاں چلنا بند ہو جائیں

تو تمہاری مل بھی بند ہو جائے۔ اور اگر تمہاری مل بند ہو جائے تو تمہاری موٹر بھی بند پڑی پڑی چھکڑا ہو جائے۔ میم صاحب۔ تم ہو کس خیال میں؟"

سندھیا تنک کر بولی۔ "اچھا اچھا زیادہ باتیں مت کرو اپنا چھکڑا نکالو گڈھے سے!"

"آدھے گھنٹے سے کوشش کر رہا ہوں مگر نکلتا ہی نہیں!"

"لاؤ میں تمہاری مدد کرتی ہوں!"

"آپ۔ آپ؟" دلیپ نے سندھیا کو سر سے پاؤں تک یوں دیکھا کر سندھیا کا چہرہ سرخ ہو گیا اور سر سے پاؤں تک اس کا جسم غصے سے کانپنے لگا۔

"کیوں۔ مجھے کیا ہوا ہے؟" وہ جھنجلا کر بولی۔

"مگر آپ کے ہات میلے ہو جائیں گے۔" یکایک دلیپ نے بے حد نرم لہجہ میں کہا۔

"کوئی پرواہ نہیں!"

"آپ کی ساڑھی خراب ہو جائے گی!"

"کوئی ہرج نہیں!"

"آپ کا میک اَپ بگڑ جائے گا!"

"تمہیں کیا؟"

"جی نہیں۔ کہاں میں ایک غریب چھکڑے والا۔ کہاں آپ ایک امیر مل مالک کی لڑکی۔ آپ میری مدد کیسے کر سکتی ہیں؟"

جواب میں سندھیا دوڑ کر چھکڑے کے پاس چلی گئی اور اسے گڈھے سے نکالنے کے لئے زور لگانے لگی۔ اور دلیپ سے بولی۔ "زور لگاؤ!"

دلیپ نے کہا۔ "بہت زور لگا تا ہوں۔ مگر یہ تو ہلتا ہی نہیں اپنی جگہ سے!"
تین چار بار دونوں نے کوشش کر کے دیکھا۔ جب چھکڑا کسی طرح گڈھے سے نہ نکلا تو سندھیا بولی۔
"چھکڑا بھاری ہے!"
"نہیں گڈھا گہرا ہے۔" دلیپ نے اس کی بات کاٹ کر کہا اور سندھیا کو بہت غصہ آیا۔ میری ہر بات کاٹتا ہے۔ کوئی بات میری اسے اچھی نہیں لگتی۔ کیسا تیزابی لہجہ ہے اس کا۔ کس قدر مغرور ہے؟ اپنی تمام تکلیفوں اور مصیبتوں کے باوجود یہ ٹھاکر زادہ کس قدر مغرور اور اپنی ذات میں مگن ہے۔ مگر میں اس کی مگن کا خول توڑ دوں گی۔ اسے پچھتانا ہوگا مجھے۔ میرے قدموں میں گرنا ہوگا۔ اس کو نہیں تو میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گی۔ غصّے سے سندھیا نے اپنے دانت پیس لئے مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔ دلیپ دھیرے دھیرے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتا رہا۔
اتنے میں دو چھکڑے پیچھے سے آنکلے اور ان سے کسان باہر نکلے اور انہوں نے دلیپ کو پہچان لیا۔ اور پھر وہ سب مل کر دھکیلتے ہوئے چھکڑے کے قریب گئے اور سب نے زور لگا کر چند منٹوں میں چھکڑے کو گڈھے سے باہر نکال دیا۔ اس کوشش میں سندھیا بھی شامل رہی۔ اس قدر زور لگانے کی خاطر نہیں بلکہ اپنی عجیب سی خفت مٹانے کی خاطر۔ اور جب گڈھے سے چھکڑا نکل آیا اور دلیپ اس پر بیٹھ گیا اس نے سندھیا کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے کہا۔
"دیکھا میم صاحب۔ اگر امیر اور غریب دونوں مل کر جور لگائیں تو اس دیش کی گاڑی بہت جلد گڈھے سے نکل سکتی ہے!"
"نامعقول۔" کہتے کہتے سندھیا کی زبان رک گئی۔ کیونکہ اب دلیپ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا تھا۔ اور دوسرے کسانوں سے گفتگو کرنے میں اس طرح مصروف

ہو گیا تھا۔ جیسے اس کے لئے سندھیا کا کہیں وجود ہی نہ ہو۔ سندھیا پاؤں پٹک کر اپنی گاڑی میں چلی گئی اور آہستہ سے گڈھے کے قریب سے گاڑی نکال کر اس نے اتنی زور سے گاڑی کی رفتار تیز کر دی کہ دلیپ کے بیل بدکتے بدکتے بچے۔ گاڑی چند لمحوں میں چھکڑوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے غائب ہو گئی اور دلیپ زور زور سے ہنسنے لگا۔

دلیپ جب اپنے چھکڑے کو لے کر واپس پالن گڈھ کے فارم پر پہنچا تو اس نے موہن سنگھ کو کھیتوں میں کام کرتے ہوئے پایا۔ اس نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "تم نے تو آج پورے دن کی چھٹی لی تھی ؟"

"جی نہیں لگا اس لئے واپس آ گیا۔" موہن نے اپنے کام میں مشغول رہتے ہوئے کہا۔

دلیپ بھی خاموشی سے اس کے ساتھ کام میں لگ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بولا۔

"یہ جو مل مالک کی لڑکی ہے اس کی شادی کہیں ہو چکی ہے ؟"

"نہیں تو۔" موہن سنگھ رک کر بولا۔

"کہیں منگنی و نگنی ۔ ؟"

"میں نے تو نہیں سنا۔ کیوں ؟" موہن سنگھ نے پوچھا۔

"یونہی پوچھ رہا تھا۔" دلیپ نے کہا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد موہن سنگھ کو شرارت سوجھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "کہیں اس کے چکر میں مت پھنس جانا۔ میں نے سنا ہے۔ بڑی چلتی ہوئی لونڈیا ہے۔ کئی تو اس کے یار ہیں ۔ !"

"بکو مت۔" یکایک دلیپ نے اس طرح گرج کر کہا کہ موہن سنگھ سہم گیا اور حیرت سے دلیپ کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ "تین چار دن ہوئے تم تو خود مجھ سے کہہ رہے تھے کہ سندھیا بڑی مغرور لڑکی ہے !"

"سو تو ہے وہ۔" دلیپ بولا۔ "بھگوان نے اگر اس کو خوبصورت بنایا ہے تو مغرور تو وہ ضرور ہو گی۔ خوبصورت لڑکی اگر مغرور نہ ہو گی تو کیا بدصورت لڑکی ہو گی؟"

"اس دن تو تم کہہ رہے تھے کہ بڑے گھر کی لڑکی بڑی نکمی ہوتی ہے۔"

"اب وہ بڑے گھر میں پیدا ہو گئی ہے تو اس میں اس کا کیا قصور؟" دلیپ نے جواب دیا۔ "اگر وہ نکمی ہے تو اس کے لئے اس کے حالات بھی تو ذمہ دار ہیں۔ ہمیں یہ بھی تو دیکھنا چاہیئے کہ بڑے گھر کی لڑکی ہو کر اس کا دل کیسا ہے؟ لوگوں سے اس کا بیوہار کیسا ہے؟ اس کے خیالات کیسے ہیں؟ چونکہ ایک لڑکی بڑے گھر میں پیدا ہوئی ہے اس لئے ضرور ہی بری ہو گی۔ یہ میں کیسے مانوں؟"

موہن سنگھ نے آہستہ سے کہا۔ "تم کبھی کچھ کہتے ہو کبھی کچھ کہتے ہو۔ تمہارے دل کا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا!"

معلوم نہیں کیوں موہن سنگھ کو تو سندھیا کی تعریف سے خوش ہونا چاہیئے تھا لیکن اس کے دل میں عجیب قسم کا حسد اور رقابت کا جذبہ سندھیا کے لئے ابھرنے لگا۔ اتنے عرصے تک دلیپ کے ساتھ کام کرتے ہوئے اس نے بطور موہن سنگھ دلیپ سے رفاقت اور دوستی کا ایک ایسا رشتہ قائم کر لیا تھا جس سے سندھیا بہت دور تھی۔ اور اب کہ جب وہ دلیپ کے دل میں سندھیا کے لئے نرم اور میٹھے جذبوں کو ابھرتے دیکھنے لگا تو اس کے دل میں عجیب سی چبھن محسوس ہوتی اور اس کا دل چند لمحوں کے لئے ایک عجیب سی اداسی سے بھر گیا۔ جیسے سندھیا وہ خود نہ ہو غیر ہو۔ دور دراز کے کسی محل میں رہنے والی ایک نکمی لڑکی جو کسی طرح دلیپ کی محبت کی حقدار نہ تھی۔ اسے کیا حق تھا کہ وہ موہن سنگھ کی محبت میں اپنا حصہ بٹائے ہ پہلی بار اس کا دل رقابت کے جذبے سے آشنا ہوا۔ اور چند لمحوں کے لئے زمین اس کے پاؤں سے کھسکتی محسوس ہوتی۔ اتنے دنوں تک دلیپ کے ساتھ کام کرتے ہوئے اسے

مرد بن کر بڑا مزہ آیا تھا۔ مرد ہونے میں کتنی آسانیاں ہیں۔ کتنی راحتیں ہیں۔ مرد سے مرد کی برابر رفاقت میں کیسی گہری اور پائیدار ہو سکتی ہے اس کا اسے اب تجربہ ہوا۔ اور یہ سوچ کر اس کا دل چند لمحوں کے لئے بے حد خائف ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہوگا کہ موہن سنگھ کو سندھیا کے لئے جگہ خالی کر دینا پڑے گی۔ حالانکہ اس کے دل نے اس سے زیادہ تو کچھ نہ چاہا تھا۔

لیکن چند لمحوں کے بعد جب یہ احساس اس پر حاوی ہوا کہ وہ خود ہی سندھیا ہے خود ہی موہن سنگھ ہے۔ اور اپنے آپ سے رقابت محسوس کرنے کے کیا معنی؟ تو اس کے ہونٹوں سے بے اختیار ہنسی نکل گئی۔

"کیوں ہنس رہے ہو؟" دلیپ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ یونہی۔" موہن سنگھ نے گھبرا کر کہا۔

فصل کٹنے کے دن آ گئے۔ یہ دن کڑی محنت اور سنہری دھوپ کے دن تھے اور بڑے خوبصورت دن تھے۔ تکمیل کی آمد کے دن ہمیشہ خوبصورت ہوتے ہیں اور ان دنوں میں کسانوں کی مسرت دیکھ کر موہن سنگھ کو محسوس ہوا کہ کسان بھی اتنا ہی خالق ہے جتنا کہ ایک مصور۔ اور وہ تصویریں جو دھرتی پر بنائی جاتی ہیں اتنی ہی حسین ہوتی ہیں جتنی وہ تصویریں جو کاغذ پر بنائی جاتی ہیں۔ ان دنوں گاؤں کے کسانوں کی انتھک محنت، ولولہ اور جوش دیکھ کر اسے وہ لمحے یاد آئے تھے جب کسی تصویر

کی تکمیل پر مصوّر کے خلاق ہاتھ گرمجوشی اور تیزی اور ایک ابلنے والے تیز تخلیقی جذبے کے زیر اثر کام کرنے لگتے ہیں۔ بلکہ وہی جذبہ تھا۔ وہی لگن۔ وہی دل کی دھڑکن۔ جب کسان گاتے تھے اور موہن سنگھ بھی ان کے گیت میں شریک ہو جاتا تھا اور اس کی لڑکیوں کی سی میٹھی اور سریلی آواز نے اسے کسانوں میں بہت مقبول بنا دیا تھا!

ایک دوپہر جب کئی دن کی جانکاہ محنت کے بعد ساری فصل کاٹ کر اکٹھی کر لی گئی اور اس کے دو حصّے کر دیئے گئے۔ ایک حصّہ کسانوں کا تھا دوسرا ٹھاکروں کا۔ اور جب کسانوں نے اپنے چھکڑے سامنے لاکر کھڑے کر دیئے تو دلیپ نے دیکھا کہ مرغ باز چاچا اور شاعر چاچا اور شطرنج کھیلنے والے تایا اور پتنگ بنانے والے پرتھوی راج اور چڑیاں پالنے والے ٹھاکر اور شرابی مصوّر سب چلے آ رہے ہیں اور ان کے ساتھ پولیس کے کئی سنتری ہیں۔

انہوں نے کھیتوں پر آتے ہی کسانوں سے کہا۔ "تم یہ حصّہ نہیں لے جا سکتے۔ اس پر ہمارا حق ہے۔"

یہ بڑے ٹھاکر تھے جو دن بھر چھپّر کے نیچے شطرنج کھیلتے رہتے تھے۔

کسان سکتے میں آ گئے۔ دلیپ نے بڑھ کر بڑے ٹھاکر سے بات کرنی چاہی تو اتنے میں شاعر چاچا آ گئے اور کڑک کر بولے۔

"زمین ہماری۔ کھاد ہماری۔ ہل ہمارے۔ بیل ہمارے۔ بیج ہمارے۔ پھر ان کسانوں کو اس فصل میں سے آدھا حصّہ کیسے ملے گا؟ ہم تو صرف ایک چوتھائی دیں گے!"

"مگر میں نے وعدہ کر لیا تھا۔ تمہیں سب معلوم ہے۔" دلیپ پریشان ہو کر اپنے رشتے داروں کو سمجھانے لگا۔

"ہمیں کچھ معلوم نہیں۔" مرغ باز چاچا اسے جھڑک کر بولے۔ "تم نے کس سے پوچھ کر وعدہ کیا تھا اور تم کو کس نے اس معاملے میں پنچ اور چودھری بنایا تھا بڑے ٹھاکر جی کی موجودگی میں تم ان کو لیوی یا لینوی اور کسانوں سے بات چیت کرنے والے کون ہوتے ہو؟"

پرتھوی راج بولا۔ "خود ہی جو جی میں آئے کر لیتے ہو۔ ہم سے کچھ پوچھتے تک نہیں!"

"آپ کو پتنگ اڑانے سے فرصت ملے تو۔ . . . . . . ." دلیپ کہنے لگا مگر چڑی مار چاچا نے اسے بیچ ہی میں روک دیا۔ "خبردار۔ ہم سب کی طرف سے تم فیصلہ کرنے والے کون ہو۔ یہ زمین تمہاری اکیلے کی نہیں ہے۔ ہم سب کی ہے۔ بس صرف ایک چوتھائی ملے گا۔ اس سے زیادہ کسانوں کو کچھ نہیں ملے گا!"

دلیپ نے گھبرا کر کہا۔ "مگر چاچا جی ———!"

فوراً مرغ باز چاچا گرجے۔ "چپ رہو۔ گستاخ۔ اگر کسی نے ہماری فصل کی طرف ہاتھ بھی بڑھایا تو اس کو وہیں ڈھیر کر دوں گا۔"

کسانوں میں بے چینی بڑھنے لگی۔ دو تین منچلوں نے لاٹھیاں سنبھال لیں۔ دلیپ پریشان ہو کر کبھی ٹھاکروں کو سمجھاتا۔ کبھی کسانوں کو ٹھنڈا کرتا۔ مگر معاملہ سلجھنے کے بجائے الجھتا گیا۔ ٹھاکر پولیس کی شہ پر گرج رہے تھے اور کسانوں کو اپنی قوت بازو پر ناز تھا۔ صدیوں کے ستائے ہوئے کسان آزادی کا سانس پا کر اپنی لہو اور پسینے کی محنت کی کمائی کو اس دھوکے دھڑی میں کیسے ضائع کر سکتے تھے وہ پولیس کی موجودگی کے باوجود مرنے مارنے پر تل گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے لاٹھیاں سنبھال لیں۔ مارو۔ مارو کی صدائیں چاروں طرف بلند ہوئیں اور سب سے پہلے انہوں نے دلیپ ہی پر حملہ کیا۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ دلیپ نے دغابازی

سے کام لیا تھا۔ اس نے کسانوں کو آدھی فصل دینے کا وعدہ کر کے ان سے مفت کام کرا لیا ہے اور اب کٹائی کے موقع پر اندر ہی اندر اپنے بھائی بندوں سے مل کر ان کا حصہ ہڑپ کرنا چاہتا ہے۔ ان کے غم و غصے کی کوئی انتہا ہی نہ تھی۔ اس لئے وہ سب مل کر سب سے پہلے دلیپ کی طرف دوڑے اور پیشتر اس کے کہ حیران اور پریشان دلیپ کوئی مدافعت کرے، اسے لاٹھیاں مار مار کر زمین پر بچھا دیا۔

موہن سنگھ تیر کی طرح دوڑتا ہوا ہجوم کو چیرتا ہوا غم و غصے سے چیختا ہوا آگے بڑھا، اور دلیپ تک پہونچنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی کشمکش میں اسکی داڑھی اتر گئی۔ کپڑے پھٹ گئے۔ مگر کسانوں کی ٹانگوں کے اندر گھس کر وہ کسی نہ کسی طرح دلیپ تک پہونچ گیا اور اسے بچانے کے لئے اس نے فوراً ہاتھ پھیلا کر اپنے آپ کو دلیپ پر گرا دیا۔ چند لمحوں میں یہ پورا واقعہ ہو گیا۔ گرتے گرتے اس کے سر پر ایک لاٹھی پڑ گئی اور اس کی پگڑی کھل گئی۔ اگر پگڑی نہ ہوتی تو سر کھل جاتا اور ممکن تھا کہ دلیپ کو بچانے کی پاداش میں کسان اس کا بھی سر کچل دیتے۔ مگر اس وقت ایک عجیب واقعہ ہوا۔

موہن سنگھ کی داڑھی اترنے، پگڑی کھلنے اور کرتے کے پھٹنے سے جو عجیب و غریب منظر سامنے آیا اسے دیکھ کر کسانوں کے ہاتھ رک گئے اور ان کی لاٹھیاں ہوا میں لہراتی رہ گئیں اور پولیس کے سپاہی بھی کسانوں پر چارج کرنے سے رک گئے۔ سب لوگ دم بخود تھے اور خون سے لت پت دلیپ سنگھ کے اوپر لیٹی ہوئی ایک لڑکی کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ایک کسان کے منہ سے دبی چیخ نکل گئی "ارے یہ تو لڑکی ہے! ہمارا موہن سنگھ۔" اتنا کہہ کر کسان نے حیرت سے اپنے منہ پر خود ہی ہاتھ رکھ لیا۔

"ہاں۔ میرا نام سندھیا ہے۔" موہن سنگھ نے اٹھ کر کہا۔ "میں مل مالک کی لڑکی ہوں۔ جس کے ہاں تم سب لوگ اپنی فصل بیچنے جاتے ہو۔"

وہ رکی۔ سب کسان اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے اور دل ہی دل میں شکر ادا کر رہے تھے کہ خیریت گذری۔ اسے کہیں چوٹ نہیں آئی ورنہ جانے کیا ہوتا۔ مل مالک تو بڑے بڑوں تک پہونچ سکتا ہے!

سندھیا نے اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے اپنے پھٹے کرتے کو اپنے دونوں ہاتوں سے سمیٹتے ہوئے کہا۔ "میں تم سے وعدہ کرتی ہوں۔ تم حملہ کئے بغیر یہاں سے چپ چاپ چلے جاؤ۔ اگر تم کو ٹھاکر حصہ نہیں دیتے ہیں۔ نہ دیں۔ میں خود تم کو تمہارے حصے کی ایک ایک پائی ادا کر دوں گی۔"

کسانوں نے ایک لمحہ کے لئے سندھیا کے پر اعتماد اور پر خلوص چہرے کی طرف دیکھا اور انہیں یقین آگیا۔ دھیرے دھیرے ان کی لاٹھیاں زمین پر اتر آئیں اور وہ سر جھکا کر منتشر ہونے لگے!

اور اب وہ دونوں فیکٹری کے ہسپتال جا رہے تھے۔ سندھیا گاڑی چلا رہی تھی اور دلیپ فرسٹ ایڈ کی پٹیاں پہنے اس کے قریب کی سیٹ پر بیٹھا تھا خیریت گذری اسے زیادہ چوٹیں نہیں آئی تھیں۔ پھر بھی سر کی چوٹ کی وجہ سے تشویش تھی۔ اسے کئی دن ہسپتال میں رہنا پڑے گا۔ بار بار وہ دونوں ایک دوسرے کو میٹھی میٹھی نگاہوں سے دیکھ لیتے۔ پھر اکدم چونک کر نظریں پھیر لیتے اور سامنے

دیکھنے لگتے۔

ایک طویل خاموشی کے بعد سندھیا نے مسکرا کر کہا۔" ایک بات تم مانو گے تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ کتنا پرفیکٹ میک اپ تھا میرا ؟"

"بالکل نہیں۔" دلیپ نے فوراً کہا۔" میں نے تمہیں پہلے ہی دن پہچان لیا تھا۔!"

"جھوٹ !" سندھیا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"سچ کہتا ہوں۔" دلیپ نے محظوظ ہو کر کہا۔" پہلے دن ہی پہچان لیا تھا۔ دوسری نگاہ میں ہی پہچان لیا تھا۔"

"پھر مجھے بتایا کیوں نہیں ؟"

"جب تم نے مجھے نہیں بتایا تو میں تمہیں کیوں بتاتا ؟"

"بتایا تو میں نے اب بھی کچھ نہیں۔" سندھیا نظریں جھکا کر کمزور آواز میں بولی۔

"اب بتانے کی ضرورت بھی کیا ہے ؟" دلیپ نے پیار بھری نظروں سے سندھیا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور اس کے جسم سے بالکل قریب لگ کر بڑے شریر لہجہ میں پوچھنے لگا۔" یہ موٹر روڈ کہاں تک جاتی ہے ؟"

"جہاں تک دل اور دھرتی جاتے ہیں۔" سندھیا نے مسرت بھرے لہجہ میں ایسی میٹھی آواز میں کہا۔ جیسے چاروں طرف ہرے بھرے گنوں کی فصل کا مٹھاس اس کے گلے میں شہد کے قطروں کی طرح ٹپک رہا ہو۔

دوسرے دن جب پالن گڈھ فارم پر کام کرنے والے کسان سندھیا کے وعدے کے مطابق شوگر مل میں پہونچے تاکہ سندھیا سے مل کر اپنے حصّے کی رقم طلب کریں تو ٹھاکر بلرام سنگھ مل منیجر بڑی خندہ پیشانی سے ان سے ملا اور انہیں بتانے لگا۔

"مگر مس سندھیا تو یہاں نہیں ہیں۔ وہ تو آج صبح اپنے باپ کے ساتھ لکھنؤ چلی گئی ہیں۔۔!"

"لکھنؤ چلی گئی ہیں؟" بہت سے کسان حیرت میں آکر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

"کب واپس آئیں گی؟" ایک کسان کے منہ سے نکلا۔

"کیا معلوم کب واپس آئیں؟" بلرام سنگھ نے کندھے اچکا کر کہا۔ "پندرہ دن کے بعد آئیں۔ ایک ماہ کے بعد آئیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لکھنؤ سے ادھر واپس ہی نہ آئیں اُدھر ہی اُدھر سے ولایت چلی جائیں!"

"ولایت چلی جائیں گی؟" منیا کے بیٹے جگتے نے چیخ کر پوچھا۔

جگنا تو جوان تھا اور اس نے ٹھاکر دل کے فارم پر بڑی مستعدی سے کام کیا تھا اور اس فصل کی کٹائی پر اس کی شادی جوہی سے ہونے والی تھی۔ اس لئے اس کی آواز میں سب سے زیادہ مایوسی تھی۔

بلرام سنگھ جو کل شام ہی صورت حال سے واقف ہو چکا تھا۔ بے حد میٹھے لہجہ میں بولا۔ "ہاں میں نے ایسا ہی سنا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں، وہ مل مالک کی لڑکی ہے۔ آپ کی اور میری غلام تو ہے نہیں۔ جہاں جی چاہے جا سکتی ہے۔ جب جی

چاہے جا سکتی ہے۔ بتایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

کسانوں نے بلرام سنگھ کو ساری بات بتا دی۔ بلرام سنگھ نے پورے واقعے کو بڑی توجہ سے سنا اور سن کر بے حد ہمدرد لہجہ میں بولا "افسوس کہ یہ آپ کا اور مِس سندھیا کا معاملہ ہے۔ میں اس معاملہ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ ہاں اگر مل کا کوئی معاملہ ہو تو مجھ سے ضرور کہیئے۔ میں ہر طرح آپ کی خدمت کرنے کے لئے حاضر ہوں!"

اسی رات چوپال میں سب کسان جمع ہوئے تو دیر تک اس مسئلے پر بحث ہوتی رہی۔ قرار پایا کہ یہ سب ٹھاکروں اور فیکٹری والوں کی ملی بھگت ہے اور اس ملی بھگت میں دلیپ بھی شامل ہے اور سندھیا بھی۔ امیر سے امیر لوگ مل گئے ہیں اور غریب کسانوں کو لوٹ رہے ہیں۔ ان لوگوں نے ہماری محنت کی کمائی خون پسینے کی کمائی دھوکے دھڑے سے جھوٹے وعدے کر کے اپنے گودام میں ڈال لی ہے اور اب وہ مزے سے چین کریں گے۔ اور ہم لوگ زمینداری کے بعد بھی اسی طرح بھوکے مریں گے جس طرح آج تک مرتے آئے ہیں۔ کچھ بڈھے کسان تو معاملے کو ڈھیل دینے کے حق میں تھے۔ لیکن نوجوان طبقہ جن میں جگتا کھیت مزدور اور لکشمن پیش پیش تھے۔ سرگرم عمل ہونا چاہتا تھا۔ بہت سے کسان ٹھاکروں کے خلاف مردہ باد کے نعرے لگانے لگے۔ تو جگتے نے خفا ہو کر کہا۔ "مردہ باد کے نعرے لگانے سے بھلا کیا ہوگا؟ آج کیا اور کل کیا ہمیشہ سے بھینس اسی کی رہی ہے جس کے پاس لاٹھی

ہے۔ اور اگر تمہارے پاس لاٹھی ہے اور اگر تمہارے ہات ٹوٹ نہیں گئے ہیں اور اگر تم اپنے بچوں کے لیئے روٹی چاہتے ہو تو اٹھو اور اٹھ کے حملہ کر دو اور ٹھاکروں کا فارم لوٹ لو۔!"

جگنا تو کب سے ٹھاکروں سے جلا ہوا تھا۔ کیونکہ ٹھاکر زادے مہندر نے جو ہی کی عزت پر ہات ڈالا تھا اور گو یہ واقعہ زمینداری ختم ہونے سے پہلے کا تھا اور اس زمانے میں یہ واقعات عام تھے۔ لیکن آدمی، آدمی ہے۔ وہ مجبور ہو کر سر جھکا دے تو دوسری بات ہے ورنہ کوئی آدمی کسی زمانے میں بھی اپنی بے عزتی سے خوش نہیں ہوا ہے۔ مظلوم نے اکثر ظلم کا ہات بھی چوما ہے لیکن مسرت سے نہیں بلکہ انتہائی مجبور ہو کر۔ اپنے دل میں خنجر رکھ کر۔ مگر اب تو ٹھاکروں کی طاقت ختم ہو چکی تھی۔ پرانا ڈر بہت حد تک ٹوٹ چکا تھا اس پر جگنے اور لکشمن اور گاؤں کے دوسرے نوجوان کسانوں اور کھیت مزدوروں کی تیز کلامی جلتی پر تیل کا کام کر گئی اور کسانوں نے غصے میں بھر کر اپنی لاٹھیاں سنبھال لیں۔

دلیپ سنگھ کو ہسپتال کے ایک اردلی نے بتایا کہ پالن گڈھ کے کسانوں نے اس کے فارم پر حملہ بول دیا ہے اور گودام لوٹا جا رہا ہے۔ دلیپ سنگھ صبح ہی سے سندھیا کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن جب اسے پتہ چلا کہ سندھیا تو آج صبح ہی اپنے باپ کے ہمراہ لکھنؤ چلی گئی ہے تو اسے بے حد تعجب ہوا۔ دیر تک وہ سکتے کے عالم میں رہا۔ پھر اسی زخمی حالت میں ہسپتال سے نکل کر اپنے فارم کی طرف بھاگا۔

جب وہ فارم میں پہنچا تو گودام لوٹا جا چکا تھا اور دونوں چھپر جل رہے تھے۔ اور گذشتہ مہینوں کی محنت کے ثمر کا ایک دانہ تک باقی نہ تھا۔ خیریت گذری کہ کسانوں نے صرف لوٹنے پر اکتفا کی اور ٹھاکروں سے جسمانی طور پر کسی

قسم کی باز پرس نہیں کی ورنہ معاملہ بے حد سنگین ہو جاتا۔
جب دلیپ آیا تو کسی نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ سب لوگ مضمحل، اداس پریشان حال اور شرمندہ بیٹھے تھے۔ دلیپ سے آنکھ ملانے کی جرأت کسی میں نہ ہوئی۔ کیونکہ یہ تو اب سب پر ظاہر تھا کہ اگر وہ لوگ صلح و صفائی سے کسانوں کو ان کی محنت کا اجر دے دیتے تو آج یہ صورت حال پیدا نہ ہوتی۔ انہوں نے پرانی دھونس کے سہارے پرانے ظلم کو قائم رکھنا چاہا تھا۔ مگر اب کسان بیدار ہو رہا تھا اور طاقت کے مرکز کو بدل رہا تھا۔
یہ لوگ اس کے جسم اور روح گوشت اور پوست کا حصّہ تھے۔ مگر اس سے کسی قدر مختلف تھے۔ دلیپ نے دھومی ندی کے کنارے اکیلے ٹہل ٹہل کر سوچا یہ لوگ پرانے خیالات اور پرانے زمانے اور پرانے خیالات کے اسیر اس چڑیو والے چاچا کے قیدی پرندوں سے کسی طرح مختلف نہ تھے اور ایک دن اسی طرح سماج کے پیٹ میں پہونچ کر ہضم ہو جائیں گے جس طرح اب تک انسانی سماج نے قبیلوں اور جاگیروں والے انسانوں کو ہضم کر لیا تھا۔ اسی طرح وہ ایک دن زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی ہضم کر جائے گا۔ اس عمل سے رہائی ممکن نہیں ہے۔ ہاں مگر یہ تو ممکن ہے کہ انسان اپنے آپ کو بدل ڈالے۔
مگر بدلنا کس قدر مشکل ہے اور جھوٹ بولنا اور کام نہ کرنا اور ردّی کاغذ کے پرزے کی طرح لہروں کے بہاؤ پر بہتے جانا کس قدر آسان ہے۔ یہ لوگ میرے گھر والے۔ میرے رشتہ دار۔ میرے دل اور جگر کے ٹکڑے جن سے میں پیار کرتا ہوں۔ بیزار ہوتا ہوں۔ محبت کرتا ہوں۔ نفرت کرتا ہوں۔ ان کو بدلنا کس قدر مشکل ہے۔ تقریباً ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ کاش کوئی ایسی ترکیب ہوتی۔ کوئی ایسی ترکیب ہوتی؟

دلیپ تقریباً روہانسا ہو کر ندی کے ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا۔

شطرنج کے بہت سے پرانے مہرے غائب تھے اور ان کی جگہ لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے کاٹ کر بے ڈول سے نئے مہرے بنا لئے گئے تھے۔ بڑے ٹھاکر کا ہات شطرنج کھیلتے ہوئے جب کسی نئے مہرے پر پڑتا تو اس کے کھردرے لمس سے متاثر ہو کر ان کے چہرے پر کرب کی لہریں دوڑ جاتیں اور ماتھے پر بیزاری کی شکنیں ابھر آتیں۔ مگر شطرنج کھیلنے سے باز نہیں رہ سکتے تھے کہ یہی ایک بادشاہی کھیل ایسا تھا جو انہیں اپنے پرانے شاندار ماضی میں لے جاتا تھا۔

بڑے ٹھاکر جڑی مار چاچا کے ساتھ شطرنج کھیلنے میں مصروف تھے کہ سامنے سے بڑی ٹھکرائین بڑی بیزاری سے بڑبڑاتی ہوئی قریب آئیں اور بولیں "گھر میں اناج کا ایک دانہ تک نہیں ہے۔ اب ہم کھائیں گے کیا؟"

"ہوں۔۔؟" ٹھاکر بازی سے نگاہیں اٹھائے بغیر بولے۔

ٹھکرائین تیز اور بلند لہجہ میں بولیں۔ "میں کہتی ہوں گھر میں اناج کا ایک دانہ بھی نہیں ہے۔ اب ہم لوگ کیا کھائیں گے؟"

بڑے ٹھاکر شدید بیزاری سے بولے۔ "کچھ بھی کھاؤ۔ مگر میرا سر مت کھاؤ اس وقت!۔ کھیل دیکھتی ہو اس وقت؟ کیا نازک موقع ہے؟"

ٹھکرائن زیر لب غصّے سے کچھ بدبداتی وہاں سے چلی گئیں۔ شاعر چاچا کو سمجھانے تو کیا دیکھتی ہیں کہ شاعر چاچا کسی کو بڑے زور و شور سے اپنا کلام سنا رہے

ہیں ؎

ہر گلی کوچے میں لیلیٰ نے منادی کر دی
لڑکے پیچھے نہیں بھاگیں میرے دیوانے کے

اس کے بعد شاعر چاچا نے جھک کر کسی کو آداب کیا۔ ٹھکرائین دل ہی دل میں تعجب کرنے لگیں کہ اس وقت شاعر چاچا کے سامنے کون لوگ ہیں۔ جنہیں کورنش بجا کر داد طلب کی جا رہی ہے۔ مگر جہاں پر وہ کھڑی تھیں وہاں سے شاعر چاچا تو نظر آتے تھے مگر سامعین نظر نہیں آتے تھے۔ وہ حاضرین کو دیکھنے کے لئے آگے بڑھنے ہی والی تھیں کہ شاعر چاچا چلا کر پھر گویا ہوئے ؎

پینے والوں نے نہیں ساقی نے توبہ کر لی
جتنے دروازے ہیں سب بند ہیں میخانے کے
چاند میں جا کر تجھے پیار کریں گے اے چاند
راستے انسان نے بنائے ہیں وہاں جانے کے

شاعر چاچا شعر سنا کر پھر جھک جھک کر آداب کرنے لگے تو ٹھکرائین جلدی سے آگے بڑھیں اور جب شاعر چاچا کے بالکل قریب پہونچیں تو دیکھا کہ زنجیروں سے بندھے دو کتے زمین پر بیٹھے ہیں جنہیں شاعر چاچا شعر سنا رہے تھے۔

بڑی ٹھکرائن غصے سے سر پٹک کر بولیں "سب مصاحب کھا پی کر رخصت ہو لئے کوئی مہاراج اب کو نا سنانے کے لئے صرف کتے رہ گئے ہیں"

"مگر بہت سخن شناس کتے ہیں۔ بھوجائی۔ دیکھو کیسے کان کھڑے کر کے داد دیتے ہیں۔"

"چاند پر جانے والے کوئی صاحب" ٹھکرائن تلخی سے بولیں "کبھی اپنی دھرتی کی بھی خبر لے لو۔ آج گھر میں گندم کا ایک دانہ نہیں ہے!"

شاعر بولے۔ "اچھا ہے کہ نہیں ہے۔ یہ سب اسی گندم کا فساد ہے۔ اسی گندم کی وجہ سے حضرت آدم جنت سے نکالے گئے تھے!"

"گندم نہ ہوگی تو ایک دن تم اس دھرتی سے کبھی نکال دیئے جاؤ گے کوی مہاراج ۔۔۔!"

ٹھکرائن اتنا کہہ کر غصے میں وہاں سے پلٹ رہی تھیں کہ سامنے سے اسے دلیپ آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے بڑی ٹھکرائن سے پوچھا۔

"تائی جی۔ آپ نے کہیں میرے ہات کی گھڑی تو نہیں دیکھی؟"

"نہیں بیٹا!"

دلیپ ٹھکرائن کے جواب سے مایوس ہو کر شاعر چاچا سے پوچھنے لگا۔ جب انہوں نے بھی حامی نہیں بھری تو پتنگ باز کے ہاں پہنچا۔

"پرتھوی راج جی۔ آپ نے کہیں میری گھڑی دیکھی؟"

پرتھوی راج بولے۔ "یاں پل کی خبر نہیں۔ تم گھڑی کو پوچھتے ہو!"

اتنا کہہ کر وہ اپنے پتنگ بنانے میں مصروف ہو گئے۔ دلیپ وہاں سے چل کر جوگیندر سنگھ کے ہاں پہنچا۔ دیکھتا کیا ہے کہ شرابی مصور اپنے سامنے شراب کا ایک بڑا مٹکا رکھے ہوئے ہے اور اس میں سے پیالہ بھر بھر کر پیتا جاتا ہے۔ دلیپ اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا اور مصور کو ترنگ میں دیکھ کر بولا۔

"بھیا۔ تم نے میری گھڑی کہیں دیکھی؟"

جوگیندر سنگھ کے سرخ چہرے پر شادمانی کی ایک لہر آئی۔ اس کی آنکھوں میں ایک شریر چمک نمودار ہوئی۔ لکنت آمیز لہجہ میں بولا۔

"اس گھڑی کا اب گھڑا بن چکا ہے پیارے ۔۔۔!"

"کیسے ۔۔۔؟"

"ایسے کہ ہم نے تمہاری گھڑی مہاجن کو دیدی اور اس گھڑی کے بدلے ایک گھڑا لے لیا۔ شراب کا بھرا ہوا۔!"

مصوّر نے اتنا کہہ کر شراب کے بھرے ہوئے مٹکے پر ہات رکھا۔

دلیپ چونک پڑا۔ غصے کی ایک تیز لہر سے اس کا سارا چہرہ کانپنے لگا۔ پھر اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور دھیمے شکایتی لہجہ میں کہنے لگا۔

"یہ تم نے کیا کیا بھیا۔ میری گھڑی تو بہت قیمتی تھی۔!"

مصوّر اس کے شانے پر ہات مار کر اسے سمجھانے کے انداز میں بولا۔ "شراب سے زیادہ قیمتی چیز کوئی نہیں ہے پیارے! شراب گھڑی سے کہیں بہتر ہے۔ گھڑی وقت کی یاد دلاتی ہے۔ شراب وقت کو سلا دیتی ہے۔ گھڑی انجام کا غم دیتی ہے۔ شراب مسرّت کا دم دیتی ہے۔ گھڑی کہتی ہے زندگی ختم ہونے والی ہے۔ شراب کہتی ہے جو لمحہ باقی ہیں انہیں اس پیالے میں ڈبو کر جاوداں کر لو۔!"

مصوّر نے مٹکے میں پیالہ ڈال کر اسے لبالب بھر کر اپنے منہ سے لگا لیا۔

دلیپ دل ہی دل میں اسے کوستا ہوا وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ اور غصے سے بھرا ہوا سیدھا بڑے ٹھاکر کے ہاں پہنچا۔ جو بیدسنتور شطرنج کھیلنے میں مصروف تھے۔ جاتے ہی بولا۔

"جوگیندر بھیا نے میری رسٹ واچ چرالی ہے اور مہاجن کے پاس بیچ دی ہے۔!"

"افسوس۔" بڑے ٹھاکر سر ہلا کر بولے۔

"افسوس کیا۔ وہ اس وقت اس گھڑی کی شراب خرید کر۔ ایک مٹکا سامنے رکھے پی رہا ہے!"

"افسوس کہ مجھے پہلے معلوم نہ ہوا!"

دلیپ بھڑک کر بولا۔ "پہلے معلوم ہوتا تو آپ کیا کرتے ہ؟"

بڑے ٹھاکر افسردگی سے سر ہلا کر بولے۔ "میں اس سے کہتا کہ ارے برخوردار میری شطرنج کے مہرے لٹ گئے ہیں۔ اگر تم اس گھڑی کو بیچ کر اپنے لئے شراب لا رہے ہو تو میرے لئے شطرنج کے مہرے بھی لیتے آنا۔ ایک پنتھ دو کاج! چال چلو چڑی مار۔!"

دلیپ جلدی سے وہاں سے پلٹ گیا اور چلتے ہوئے زور زور سے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارنے لگا۔ "یہاں کوئی کسی سے کیا کہے۔ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔"

☆

آدھی رات کے وقت سندھیا گھبرا کر ہوٹل کے کمرے سے باہر نکل آئی اور کارلٹن کے خوبصورت لان کے ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ چاندنی رات کی طرح برس رہی تھی! اور کیاریوں میں کھِلے ہوئے گلاب گویا منہ کھولے ہوئے اس چاندنی کو پی رہے تھے۔ لان سے پرے یوکلپٹس کے پیڑوں سے الائچیوں کی سی مہک آ رہی تھی۔ اس چاندنی اور مہک نے رات کے سناٹے کو ایک عجیب تشنگی اور درد سے معمور کر دیا تھا۔ رات کا جسم اس کے اپنے جسم کی طرح دُکھتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ کسی کے لمس کا پیاسا۔ حالانکہ چاندنی برس رہی تھی۔ مگر یہ چاندنی گویا رات کی جلد اور اس کے جسم کی جلد کے اوپر سے برستی ہوئی گذر رہی تھی اور اندر تحلیل نہ ہو سکتی تھی۔ اندر جہاں خون لاوے کی طرح گرم تھا۔ رات اور سندھیا دونوں دہک رہے تھے ہوٹل کے کمرے میں کہیں کہیں روشنیاں نظر آتی تھیں۔ کوئی اس کی طرح جاگ رہا تھا۔ بہت دیر کے بعد سب کھڑکیوں کی روشنیاں بجھ گئیں۔ صرف ایک کھڑکی کی روشنی باقی رہی۔ اس روشنی کے ہالے میں ایک عورت کا چہرہ نمودار ہوا۔ بال کھلے تھے، ہونٹ بھی کھلے۔ آنکھیں بھی کھلیں۔ شانے بھی کھلے۔ یہ عورت بھی رات کی طرح سے انتظار

کرتی ہے۔ اپنے دونوں ہاتوں میں اپنا چہرہ لئے ہوئے کچھ سوچ رہی ہے۔ کتنے دور اس کے خیالات جاتے ہیں۔ بے تار برقی لہروں کی طرح کسی کے پاس پہونچکر اسے واپس بلاتے ہیں۔ عورت بندرگاہ کی طرح کیوں ہے۔ اپنی آغوش وا کئے دور دور تک سفر کرنے والے جہازوں کو اپنی گودی میں کیوں بلاتی ہے؟ کیا اس کی تقدیر میں ٹھہر کر انتظار کرنا ہی لکھا ہے۔ یا کہ یہی اس کی فطرت ہے؟ خیالوں کے دھاگے اس قدر کمزور کیوں ہوتے ہیں۔ وہ پہونچنے والے تک پہونچ کیوں نہیں سکتے۔ بیچ ہی میں ٹوٹ جاتے ہیں کہیں پر۔ یا اگر پہونچ جاتے ہیں تو مچھلی کے کانٹے کی طرح کسی کے ذہن میں اٹک کیوں نہیں جاتے اور اسے اپنے پاس بلا کیوں نہیں سکتے کب سے وہ اس لان میں بیٹھی خیالوں کی لہریں دلیپ کے پاس بھیج رہی ہے مگر دلیپ اس کے پاس اسی وقت کیوں نہیں آ جاتا۔ دلوں کے اندر بے تار برقی کا ایک سٹیشن ہونا چاہیئے۔ کھٹ کھٹ کیا اور پیغام پہونچ گیا۔ رات پیاسی ہے۔ رات پیاری ہے۔ رات پھولوں سے مہکتی ہے۔ رات چاندنی سے چمکتی ہے اور ہوا کے نیم گرم جھونکوں سے سانس لیتی ہے۔ اور اک آہ بھرتی ہوئی قریب سے گذر جاتی ہے۔ کھڑکی میں اپنا چہرہ نکالے وہ عورت اسی طرح انتظار کر رہی ہے۔ یکایک پیچھے سے ایک مرد کا چہرہ نمودار ہوتا ہے۔ وہ مرد اپنے دونوں ہات اس کے شانوں پر رکھ دیتا ہے۔ عورت چونک جاتی ہے۔ پھر سمجھ جاتی ہے۔ پھر اس کے چہرے پر کامل اطمینان اور سکون کا وہ تبسّم آتا ہے جیسے گودی میں جہاز آجائے۔ عورت پلٹتی ہے اور اپنی خوبصورت ننگی باہیں کسی بیل کی لچکتی شاخوں کی طرح اپنے مرد کے گلے میں ڈال کر اٹک جاتی ہے اور کھڑکی بند ہو جاتی ہے۔

سندھیا اپنی باہنوں میں منہ چھپا کر دھیرے دھیرے رونے لگی۔ رونے سے آرام ملتا ہے۔ جلتے ہوئے خون میں آنسو گرتے ہیں اور اس کی حدّت کو

بجھاتے ہیں۔ چاندنی پلاسٹک کی شفاف پرتوں کی طرح لان پر گر رہی ہے چاندنی اگر بارش ہوتی۔ اگر چاندنی سے جسم بھیگ سکتا تو چاندنی سے کبھی آرام ملتا۔ مگر۔ چاندنی سے آرام نہیں ملتا۔ اسی لئے عورتیں چاندنی میں روتی ہیں۔ اور انتظار کرتی ہیں۔ اس کھڑکی کے پردے سرک گئے۔ اور وہاں اندھیرا ہو گیا۔ یکایک سندھیا کو محسوس ہوا کہ وہ چاندنی میں بیٹھی ہے اور اندھیرا چاہتی ہے۔ ٹھنڈا سا اندھیرا۔ صرف دو باہوں کا اندھیرا۔ رات کے سایوں میں لپٹے ہوئے بوسوں کا اندھیرا۔ کسی کے بات کی طرح جسم کے انگ انگ پر سرکتا ہوا اندھیرا۔ اندھیرا جو انگڑائی کی طرح ٹوٹتا ہے۔ اور پھر جڑ جاتا ہے۔ اسی شفاف چاندنی میں اپنے اندھیرے کی تلاش ہی سے آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں

بہتے ہوئے آنسوؤں کے درمیان سندھیا کو سب سے پہلے دلیپ پر غصہ آیا کہ وہ اس وقت یہاں کیوں موجود نہیں تھا۔ بے شک دلیپ کو معلوم نہ ہوگا کہ وہ اس وقت لکھنؤ کے کارلٹن ہوٹل کے لان پر بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ مگر اسے اس وقت یہاں موجود ہونا چاہیئے۔ عقل یوں سوچے نہ سوچے مگر عورت کی جبلت کبھی کبھی یوں سوچ لیتی ہے اور سوچ کر اپنے محبوب سے خفا ہو جاتی ہے۔ پھر اسے اپنے آپ پر غصہ آیا۔ سیٹھ دھنپت رائے اپنی بیٹی کو چکمہ دے کر لکھنؤ لے آیا تھا۔ اس نے اسے بتایا تھا کہ اس کا چچا بہت بیمار ہے اور اس نے چچا کی بیماری کا اس لئے نام لیا تھا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ سندھیا اپنے چچا کو بہت چاہتی ہے۔ اس لئے وہ فوراً دلیپ کو اطلاع دیئے بغیر اپنے باپ کے ساتھ لکھنؤ چلی آئی۔ مگر لکھنؤ آکر معلوم ہوا کہ اس کا چچا تو بھلا چنگا ہے اور یہ جھانسہ اس کے باپ نے اس لئے دیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کا دل دلیپ سے ہٹانا چاہتا تھا اور اس کی شادی بلرام سنگھ سے کرنا چاہتا تھا۔ یعنی اپنی پسند سے! تو پھر عورتوں کو پڑھانے کا مطلب کیا ہے؟ انہیں آزادی دینے

کا مطلب کیا ہے؟ انہیں یورپ بھیجنے کا مطلب کیا صرف اتنا ہے کہ ان کے جسم پر ایک چمکتا ہوا اجنبی پالش چڑھ جائے اور ان کی روح بدستور اپنے والدین کی غلام رہے؟ ان کی مرضی کے خلاف عطا کئے گئے۔ شوہروں کی خدمت گذار رہے روح انکار کرے مگر جسم اقرار کرتا ہے۔ یہ ریشم میں لپٹی ہوئی۔ زیوروں میں لدی ہوئی باندیوں سے گھری ہوئی۔ موٹروں میں بند عورتیں کس طرح ان برقعہ پوش عورتوں سے بہتر ہیں جنہیں آزادی کی ہوا نہیں لگی۔ نرم نرم روئی کے گالوں میں ملفوف انگور کے دانوں کی طرح یہ سیم تن نازک عورتیں بال روم کے فرش پر ڈولتی ہوئی کس قدر ناکارہ اور کمزور معلوم ہوتی ہیں اپنی تمام مہذب اداؤں۔ انگریزی فقروں۔ اور کے گولوں اور کافی کے پیالوں، کے باوجود کیسی کرم خوردہ نظر آتی ہیں؟ سندھیا کے باپ نے اپنی آنکھوں میں آنسو لاکر اپنی بیٹی سے التجا کی تھی کہ وہ بلرام سنگھ سے شادی کرلے۔ کیونکہ اس کا کوئی بیٹا نہ تھا جو اس کے بعد مل کو سنبھال سکتا۔ اور بلرام سنگھ اس کی مل کا منیجر تھا۔ بڑے خاندان کا تھا اور ہر لحاظ سے اس لائق تھا کہ سندھیا اس سے شادی کرلے۔ باقی رہا دل۔ تو دل کو تو کسی نہ طرح قرار آہی جاتا ہے۔ دل تو کسی نہ کسی طور سنبھل ہی جاتا ہے۔ مگر مل کا سنبھلنا مشکل ہے —!
اس لئے جب معاملہ دل اور مل میں ہو تو ترجیح ہمیشہ مل کو دینا چاہیئے۔!

پھر کل رات ڈنر سے پہلے دودھیا روشنیوں میں ناچتے ہوئے بلرام سنگھ نے اس کی کمر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس سے شادی کی درخواست کی تھی۔ اور سندھیا نے جل کر اس سے کہا تھا۔

"مگر میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔!"

"مجھ سے نفرت کرتی ہو اور اس دیوالئے ٹھاکر کے بھتیجے دلیپ سے پیار کرتی ہو جسے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے؟" بلرام سنگھ نے کہا۔

سندھیا بولی۔ "وہ تم سے زیادہ تمیز دار ہے۔ مسٹر بلرام سنگھ یاد رکھو۔ میرا دل میرا ہے۔ جس پر میرا دل آئے گا وہی اس کا حقدار ہوگا۔ تمہارا اس پر کوئی حق نہیں ہے۔!"

بلرام سنگھ بولا۔ "مگر مجھے اپنی محبت جتانے کا تو حق ہے۔ اتنی بات کہنے کا تو حق ہے کہ جس سے تم محبت کرتی ہو۔ وہ تمہارے لائق نہیں ہے۔ اس کا خاندان دیوالیہ ہو چکا ہے۔ اس کی فصل لٹ چکی۔ اس کا فارم ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا۔ اور اب میں تم کو خبر دیتا ہوں کہ اس کے خاندان والوں نے اپنی کھیتی باڑی بھی الگ کر لی ہے۔ اب وہ اکیلا تنہا اور بے یار و مددگار ہے۔ ایک ناکام انسان۔ مس سندھیا! اب تم اس کی آرزوؤں کے ویرانے میں جا کر کیا کرو گی؟"

"محبت ویرانے کو بھی گلزار بنا دیتی ہے۔" سندھیا نے دانت پیس کر کہا تھا۔

"ہرے بھرے گلزار بھی بے عقلی سے تباہ ہو جاتے ہیں۔ اپنے آپ کو تباہ مت کرو۔ جمی جمائی مل کے عیش و آرام پر لات مت مارو۔ اس خوبصورت فضا کو دیکھو۔ یہ جگمگاتی روشنیاں۔ یہ سرخ و سپید چہرے۔ یہ سر سراتا ریشمی ماحول۔ یہی زندگی ہے۔ ان کو چھوڑ کر کہاں جاؤ گی۔ اس گھاس پھوس گندے جھونپڑوں۔ غلیظ کھیتوں والی اجڈ اور گنوار دنیا میں۔ جہاں دلیپ رہتا ہے؟"

اور سندھیا غصے سے بپھر کر بولی تھی۔ "ارے تم اس دنیا کو گالی دے رہے ہو جس کے دم سے تمہارے شہروں کا نظام قائم ہے۔ مجھے ان جگمگاتی روشنیوں کا لالچ مت دو۔ میں آدھی دنیا دیکھ چکی ہوں۔ اب میں جانتی ہوں کہ ان خوبصورت روشنیوں کے اندر کیسی کیسی معصوم آرزوؤں کا اندھیرا ہے۔ ان سرخ و سپید

چہروں کے اندر کسی کی محنت کا خون دوڑ رہا ہے۔ ان سر سراتی ریشمی ساڑھیوں میں چھپی ہوئی کسی غریب کی عریانی ہے؟"

پھر ڈانس ختم ہو گیا تھا اور بلرام سنگھ نے اس کی کمر سے ہاتھ ہٹا لیا تھا اور دونوں ہاتھوں سے تالی بجاتے ہوئے اس سے کہنے لگا تھا۔" ڈانس بہت عمدہ تھا اور تمہاری تقریر بھی بہت اچھی تھی۔ مگر اس بے رحم دنیا میں صرف آدرش واد سے کام نہیں چل سکتا۔ حقیقت مل کے فولادی مشینوں کی طرح سخت ہوتی ہے۔ حقیقت کو سمجھو۔ میں انتظار کر سکتا ہوں اور تمہیں حقیقت کو سمجھنے کا ایک موقع اور دیتا ہوں۔!"

اتنا کہہ کر وہ اسے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ پھر کسی دوسرے بلرام نے اس سے ڈانس کی درخواست کی تھی۔ کیونکہ بینڈ پھر بجنے لگا تھا۔۔۔۔۔۔

تیسرے پہر کی چاندنی جب شبنم سے بھیگنے لگی۔ جب گلاب کی پتیوں کر اوس کشید کی گئی شراب کی طرح قطرہ قطرہ کر کے بہنے لگی۔ جب کارلٹن کے لان پر کی گھاس پر ننھی ننھی بوندیاں یوں چمکنے لگیں جیسے آسمان پر ستارے نکل آتے ہوں تو یکایک ہوا کے تیز جھونکوں سے یوکلپٹس کے پتے کھڑکھڑانے لگے۔ سندھیا نے خنک ہوا کے جھونکوں کو اپنے شانوں پر محسوس کیا۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ گویا چاندنی کے خواب سے جاگ گئی۔ اس نے ایک بار ٹھٹھر کر اپنی گرم شال کو اپنے شانوں پر لے لیا۔ اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور کرسی سے اٹھ کر لان سے گذرتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔ گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی۔۔۔ اب وہ کیا کرے۔۔۔۔۔۔ کیا نہ کرے۔۔۔؟

پورچ میں کھڑے ہوئے دو چوکیداروں نے اسے سلام کیا۔ ان کے سلام کا جواب اپنے سر کی ایک خفیف جنبش سے دے کر وہ اوپر جانے والا زینہ چڑھنے لگی۔ زینے کو ایک خوبصورت فانوس روشن کر رہا تھا۔ سندھیا نے زینہ چڑھتے چڑھتے سامنے کی دیوار سے لگے ہوئے قد آدم آئینے میں اپنی صورت دیکھی تو چند ثانیوں تک ٹھٹھک کر اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ باہر کی چاندنی نے گویا اس کے حسن کو نکھار دیا تھا۔ بال الجھے الجھے سے اور ان میں چھلّے پڑے ہوئے اور گال گویا شبنم میں دھوئے ہوئے اور آنکھوں کی سوگوار کیفیت ایسی منموہنی اور پیاری کہ اگر اس وقت دلیپ دیکھ لیتا تو بے اختیار اسے اپنے گلے سے لگا لیتا۔ چند لمحوں تک اپنے عکس جمال سے مسحور سندھیا وہیں کھڑی رہی پھر بڑی احتیاط سے اس نے اپنی کمر کے خم کے قریب اپنی ساڑھی کو ٹھیک کیا اور پھر اوپر چلی۔

اوپر کی منزل کے دونوں برآمدوں کی بتیاں ایک کے سوائے گُل ہو چکی تھیں اس کے باپ کا کمرہ دائیں ونگ میں تھا اور اس کا اپنا بائیں ونگ میں اور بیچ میں سنگ مرمر کے پانچ ستونوں کے درمیان ایک چھوٹا سا خوبصورت لاونج تھا۔ مگر ایک چھوٹی تپائی پر ایک خاکدان میں ایک سگریٹ جل رہا تھا۔ اپنے کمرے کی طرف مڑتے مڑتے یکایک ایک لمحہ کے لئے سندھیا رکی۔ اس وقت آدھی رات میں کون اس کی طرح جاگ رہا تھا اور لاونج میں بیٹھ کر سگریٹ پی رہا تھا؟ یا تھی؟ کیونکہ لاونج کے لیڈیز ٹائلیٹ کی بتی اندر سے روشن تھی۔ یکایک ٹائلیٹ کے

دروازے پر کھٹکا سا ہوا۔ اور سندھیا فوراً ایک ستون کی آڑ میں ہو گئی۔

ٹائلیٹ سے لولا میک گی بہت ہی مصفا اور روشن ہو کر نکلی۔ لولا میک گی کو وہ جانتی نہیں تھی۔ مگر پہچانتی ضرور تھی۔ لولا میک گی مل منیجر بلرام سنگھ کی دوست تھی۔ اور بالعموم ہر ہفتے کے آخر میں لکھنؤ سے یا لن گڈھ جاتی تھی۔ جہاں ان کی مل تھی اور چپ چپ کر بلرام سنگھ کے بنگلے میں ٹھہرا کرتی تھی۔ کئی بار سندھیا نے اسے بلرام سنگھ کے بنگلے کے باغ میں چاندنی راتوں کو بلرام سنگھ کے ساتھ یا اکیلے ٹہلتے دیکھا تھا۔ اب کہ جب خود اس کی شادی بلرام سنگھ سے ہونے جا رہی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ اپنے باپ سے بلرام سنگھ اور لولا میک گی کے تعلقات کا ذکر کر کے اس تجویز کو رد کرا دے گی۔

مگر لولا میک گی اس وقت اوپر کے لاونج میں کیا کر رہی تھی؟ جبکہ بلرام سنگھ کا کمرہ ہوٹل کی نچلی منزل پر تھا۔

لولا میک گی نے ٹائلیٹ سے نکل کر ایش ٹرے پر رکھا ہوا اپنا سگریٹ اٹھایا۔ ایک کش لے کر اسے ایش ٹرے کے پیندے میں زور سے دبا کر بجھا دیا۔ پھر اس نے اپنے بٹوے میں لگے ہوئے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا اور جب اسے ہر طرح سے اطمینان ہو گیا تو وہ مسکرا اٹھی اور اپنا پرس جھلاتی ہوئی دائیں ونگ میں چلی گئی۔

چلتے چلتے وہ ایک کمرے کے سامنے جا کر رک گئی۔

سندھیا کا دل دھک سے رہ گیا یہ اس کے باپ کا کمرہ تھا۔

لولا نے دھیرے سے کمرہ کھٹکھٹایا۔ کمرے میں روشنی ہوئی۔ پھر کمرہ دھیرے سے کھلا۔ سندھیا ستون کی آڑ میں اور بھی سمٹ گئی۔ اس کی سانس زور زور سے چلنے لگی۔ اس کا باپ لولا کو دیکھ کر اپنے کمرے سے ایک قدم باہر نکلا۔ اس نے شب خوابی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس نے بازو سے لولا کو تھام لیا اور اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔

پھر کمرہ بند ہوگیا۔ مگر اندر کی بتی دیر تک روشن رہی۔ اور دیر تک سندھیا سنگ مرمر کے ٹھنڈے ستون سے لگی ہوئی سوچتی رہی کہ اب وہ اپنی قسمت کی فریاد کس کے پاس لے کے جائے؟ لولا میک گی بلرام سنگھ اور سیٹھ دھنپت رائے دونوں میں مشترک تھی۔ اس سے پہلے ان کے درمیان شوگر مِل مشترک تھی اور ان کے خیالات مشترک تھے اور اب یہ دونوں اونچے اور باعزّت آدمی اس بندھن کو اور پکّا کرنے کے لئے اسے بھی شکنجے میں جکڑ رہے تھے۔ یعنی تم مجھے اپنی محبوبہ دو۔ میں تمہیں اپنی بیٹی دیتا ہوں۔ کیا خوب نقد یہ سودا ہے؟ مگر اس سودے میں وہ خود کہاں ہے؟ ترازو کے اندر؟ اس کے رنڈوے باپ کو اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق گذارنے کا حق تھا مگر اسے اپنی بیٹی کی محبت غضب کرنے کا حق کیا تھا؟ اس ترازو کے اندر وہ اپنی بیٹی کی زندگی کو کیوں جھونک رہا تھا؟

غم اور غصّے سے پہلے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ پھر وہ یہ سوچ کر مسکرانے لگی کہ لولا میک گی نے اس کے باپ کے کمرے کے اندر جاکر اسے اسی وقت بہت سے پرانے جذباتی بندھنوں سے آزاد کر دیا تھا اور یہ پرانے جذباتی بندھن اب رہے کہاں ہیں! بجلی کے کوندے کی طرح لپک کر لولا میک گی نے اس کے ذہن کو صاف کر دیا تھا۔ آج کل باپ باپ نہیں۔ وہ ایک گولک ہے جس میں ہات ڈال کر بیٹی پیسے نکال لیتی ہے۔ بیٹی بیٹی نہیں ہے ایک بزنس کا پرامسری نوٹ ہے۔ دوست دوست نہیں ہے۔ خوشنما وعدوں کی رسید ہے۔ کوئی قربانی قربانی نہیں ہے۔ حال کو گروی رکھ کر بہتر مستقبل کو حاصل کرنے کا اسٹامپ پیپر ہے۔ اور زندگی کے سب سے اچھے اور خوبصورت اصول وہی ہیں جو کسی چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ سے پاس کرائے جاسکیں۔ ایسے ماحول میں وہ اپنے باپ سے کیا کہہ سکتی ہے۔ اور اس سے کس طرح کے انصاف کی توقع کر سکتی ہے۔ اب جو کچھ کرنا ہوگا

اسے خود کرنا ہوگا۔!

اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے سندھیا نے طے کر لیا کہ وہ اپنی شادی کے خلاف اپنے باپ سے کچھ نہیں کہے گی اور کسی کو کچھ بتائے بغیر صبح کی پہلی گاڑی سے لکھنؤ چھوڑ دے گی اور دلیپ کے پاس چلی جائے گی۔!

بٹوارے کے بعد جب دھن تال کے بندھ پر جاکر دلیپ نے بابو بھیکو رام سے اپنے کھیتوں کے لئے پانی مانگا تو بابو بھیکو رام نے صاف انکار کر دیا۔ پوچھنے پر بلکہ کسی قدر ڈانٹنے پر بھیکو رام نے بتایا کہ اسے مل منیجر ٹھاکر بلرام سنگھ کی ہدایت تھی کہ کسی قیمت پر دلیپ کو دھن تال سے پانی نہ لینے دیا جائے۔ دلیپ مایوس ہو کر وہاں سے لوٹ آیا۔

اسی شام جب ٹھاکر لوکیندر سنگھ مسکینؔ یعنی شاعر چاچا جب بندھ کی تکلیف دہ چڑھائی چڑھ کر بابو بھیکو رام کے پاس پہونچے تو پہونچتے ہی ہانپنے لگے۔ بابو بھیکو رام ان کے قریب بیٹھا مسکراتا رہا۔ جب شاعر چاچا اچھی طرح سے ہانپ چکے اور اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھ چکے۔ تو بابو بھیکو رام مسکرا کر بولا۔

"کہئے۔ کویی مہاراج! آج کدھر کا رُخ کیا ہے؟"

"آپ ہی کے پاس آئے ہیں۔" شاعر چاچا جل کر بولے۔ پھر اپنے آپ سے بولے۔ "لاحول ولا۔۔۔ اب زندگی میں یہی کام کرنے کے لئے باقی رہ گیا تھا۔۔۔!"

"فرمائیے۔ کیا بات ہے؟" بھیکو رام نے پوچھا۔ پھر خود ہی جواب دینے

ہوئے بولا۔ "کچھ پانی کا معاملہ ہوتا ہے!"

"اجی کیا بتائیں۔" شاعر چاچا خجل ہو کر بولے۔ "پانی ہی کی بات ہے اور اسی بات کے مارے ہم شرم سے پانی پانی ہوئے جا رہے ہیں۔"

"سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔ کیا بات سے بات پیدا کی ہے۔" بابو بھیکو رام ہر چند کہ محض ایک بابو تھے۔ مگر لکھنؤ کے کائستھ تھے۔ اور بات کی نزاکت کو سمجھتے ہیں! اس لئے دل کھول کر داد دینے لگے۔ پھر بولے۔

"آپ کے لئے پانی کی مناہی نہیں ہے۔ منیجر صاحب بول گئے ہیں!"

"جزاک اللہ۔ جزاک اللہ!!" شاعر چاچا ہات اٹھا کر بولے۔ "خدا مرحوم منیجر صاحب کو کروٹ کروٹ جنّت بخشے۔ آ۔ آ۔ میرا مطلب ہے مل منیجر صاحب کی عمر دراز ہو۔" پھر بابو بھیکو رام کی طرف دیکھ کر امیّد افزا لہجے میں بولے "تو کل سے ہمارے کھیتوں میں پانی پہونچ جائے گا؟"

"اجی شاعر صاحب۔ اس میں مطلق دیر نہ ہوگی۔ ادھر آپ نے پیسہ دیا اُدھر پانی آپ کے کھیتوں میں پہونچ جائے گا۔"

شاعر چاچا کا چہرہ اکدم اتر گیا۔ آزردہ ہو کر بولے۔ "پیسہ۔ ؟ اجی بابو صاحب شاعروں کے پاس پیسہ کہاں ہوتا ہے؟ کہئے تو ایک غزل حاضر کروں۔ ایک قصیدہ عرض کروں۔ ایک مدحیہ عرض کروں یوں لکھ دوں؟ مگر پیسہ کہاں سے لاؤں؟"

بابو بھیکو رام ہنس کر بولا۔ "پیسہ نہیں ہے آپ کے پاس؟ تو ایسا کیجئے کوی مہاراج۔ آپ اپنے کھیت میں بیج کے بجائے شعر بوئیے۔ محبت کی کھاد ڈالیے۔ ہجر و فراق کا پانی دیجئے اور جب فصل تیار ہو جائے تو غزلیں کاٹ لیجئے!"

شاعر چاچا اکدم بھڑک کر کھڑے ہو گئے۔ "آپ تو مذاق کرتے ہیں بابو بھیکو رام۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں بھی آپ سے بدلے لے کے رہوں گا۔ اگر میں نے دو دن

کے اندر اندر آپ کے والد ماجد کی شان میں چھ سو شعر کی ہجو نہ لکھی تو میں اپنا نام تو کیا اپنا تخلص تک بدل ڈالوں گا۔ ! واللہ !"

شاعر چاچا اتنا کہہ کر اِکدم غصّے سے پلٹ کر لوٹ گئے۔ بابو بھیکو رام دیر تک ہنستا رہا۔

دھن تال بندھ سے واپس آنے پر دلیپ پانی کی قلّت اور موقع کی نزاکت سے بخوبی واقف کفار سیدھا دادی اماں کے پاس گیا۔ جو آج کل اکثر بڑے پیپل کے پیڑ کے نیچے کھاٹ پر پڑی رہتی تھیں۔ ان کا انگوری رنگ، کھلے کھیتوں کی دھوپ سے اور کبھی جھلس گیا تھا۔ اور ان کی مضبوط مردانہ ٹھوڑی کے نیچے کی لٹکتی ہوئی کھال میں گہری سلوٹیں پڑتی جا رہی تھیں لیکن آواز کا کرارہ پن بدستور موجود تھا۔ دلیپ کی باتیں سن کر انہوں نے بڑے ٹھاکر کنور سنگھ اور خاندان کے دوسرے افراد کو جمع کیا اور غصّے سے کانپتی ہوئی آواز میں بولیں۔

"اے جنم جلو۔ کیوں مت ماری گئی ہے تمہاری۔ تم کیوں برباد ہونے پر تُل گئے ہو؟" پھر دلیپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔ "یہ لڑکا ٹھیک کہتا ہے پہلے بھی ٹھیک کہتا تھا۔ جب کسانوں سے فصل چکانے کا فیصلہ آن پڑا تھا اُس وقت بھی یہ ٹھیک کہتا تھا۔ آج بھی جب تمہارے اس کے سب کھیت پانی نہ ہونے سے بنجر اور ویران پڑے ہیں۔ آج بھی یہ ٹھیک کہتا ہے۔ ارے کیوں تمہاری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کی بات مان لو۔ ارے۔ ندی کے کنارے تک تو ہمارے کھیت جاتے ہیں۔ بندھ کے پانی کے لئے تمہارے پاس پیسہ نہیں ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ تم دھوبی ندی سے ایک چھوٹی سی نہر کھود کے اپنے کھیتوں میں پانی لے آؤ۔ سب مل کے کام کروگے تو بہت جلد نہر لے آؤگے۔ ارے میرے تو ہاتھ جواب دے چکے ہیں ورنہ میں خود دلیپ کے سنگ ایک کدائی اٹھا کر ندی پر چلی جاتی۔ ارے کام چور رو

یہ نہر کھود ڈالو۔ تو عمر بھر کے لئے کھیتوں میں پانی کی قلت نہیں رہے گی۔ میری تو باہنوں کا چام لنگ گیا ہے ورنہ میں تم کو کام کر کے دکھا دیتی، نکھٹوؤ!"

بڑے ٹھاکر آنا کانی کرتے ہوئے بولے۔ "مگر دادی اماں، جب ہم الگ ہو چکے تو اکٹھا کام کرنے کے کیا معنی؟"

"شرابی مصور بولے۔ "جی ہاں۔ بجا فرمایا۔ دادی اماں۔ جب تک ساجھا تھا ساجھا تھا۔ اب جب ساجھے کی کھیتی نہیں ہے تو ساجھے کا اور کوئی کام بھی کیوں ہو؟"

شاعر چاچا سر ہلا کر بولے۔ "اور یہ نہر تو کسی طرح نہیں آ سکتی ہمارے کھیتوں میں۔ دھوسی ندی سے ہمارے کھیتوں تک راستے میں اونچے اونچے دس بارہ ٹیلے ہیں۔ ان کو کون کاٹے گا؟"

دادی کے چہرے کی لاتعداد جھریوں میں غصے کی سرخ لہر دوڑنے لگی۔ "ارے کوی مہاراج۔ وہ جو تم دن رات فرہاد کی شاعری کرتے رہتے ہو۔ وہ فرہاد کیا تمہارا چچا تھا۔ جو دن رات تم اس کے گن گاتے ہو۔ ایک نگوڑی عورت کے لئے وہ اتنے بڑے بڑے پہاڑ کاٹ گیا۔ تم اپنے پیٹ کے لئے دو چار ٹیلے بھی نہیں کاٹ سکتے اچھا ٹیلے بھی مت کاٹنا۔ ان کے گرد نہر گھما کے لے آنا۔ اتنی بھی عقل نہیں ہے تم میں؟"

بڑے ٹھاکر پھر بیزار ہو کر بولے۔ "مگر سوال تو یہ ہے کہ جب ہم ایک دوسرے سے الگ ہو چکے۔ تو پھر مل کر کام کیوں کریں؟ سوال تو یہ ہے؟"

جرنیل چاچا اپنے بھائی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بولے "ہاں یہی تو سوال ہے!"

"ٹھیک ٹھیک ہے، میں سمجھ گئی۔ تم کیا چاہتے ہو؟ تم صرف شطرنج کا

سوال حل کر سکتے ہو۔ زندگی کا کوئی سوال تم سے حل نہ ہوگا۔ اب میں جان گئی۔!"

یکایک دادی اماں چپ ہوگئیں۔ ان کا پوپلا چہرہ یکایک بہت پرانا سوکھا ہوا نظر آنے لگا۔ جب آنکھوں کے پپوٹے لٹک گئے اور ہونٹ بند ہو گئے تو ان کا چہرہ ایک خوفناک ماسک کی طرح نظر آنے لگا۔ اس ماسک کے پیچھے دادی اماں کیا سوچ رہی ہیں۔ کیا وہ رو رہی ہیں۔ کیا دعا کر رہی ہیں؟ کیا گالی دے رہی ہیں؟ کیا ایک مینڈک کی طرح اپنی روح کے برف خانے میں سکڑ ٹھٹھر کر خاموش ہو گئی ہیں۔

یکایک جیسے وہ کسی گہرے کنوئیں کے اندر سے بولیں۔ "اے دلیپ بیٹا! اب تو جا، چلا جا۔ میرے سامنے سے۔ اب انہیں دیکھ کر نہیں۔ اب تجھے اپنے سامنے دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔ تو کن لوگوں کے لئے اپنا جیون تباہ کر رہا ہے؟ بیٹا۔ اب کبھی مجھ سے کچھ مت کہنا۔ میں ہار گئی!۔ یہ لوگ میری کوئی بات نہیں مانیں گے تیری کوئی مدد نہیں کریں گے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سن لیا تو نے؟۔ کہ اب کچھ اور سننا چاہتا ہے؟"

دلیپ سر جھکا کے وہاں سے چلا گیا۔ ان لوگوں نے اسے وہاں سے جاتے ہوئے دیکھا۔ پھر اپنے چھپر سے ایک کدال اٹھا کر نکلتے ہوئے دیکھا۔ کدال کندھے پر رکھے وہ اکیلا دھومی کے کنارے چلا گیا اور کھیتوں کی طرف بیٹھ کر کے نہر کھودنے لگا۔ دن بھر وہ اکیلا ہی نہر کھودتا رہا۔ اور جب سورج ڈوبنے لگا تو اس نے اپنے ہاتھ سے کدال چھوڑ دی۔ دیر تک وہ ایک ٹیلے کی اوٹ میں بیٹھا سستاتا رہا۔ اسی اوٹ میں اس نے اپنے کپڑے اتار کے رکھے اور ندی میں اتر گیا۔ دیر تک اسی میں نہاتا رہا۔ ندی کا پانی عورت کے ہاتھوں کی طرح نرم گرم اور لچکیلا تھا۔ جیسے وہ اپنے ہاتھ دیر تک اس کے جسم کی مالش کرتے رہے۔ وہ دیر تک پانی میں نہاتا

رہا اور اس کی ساری تھکن مٹ گئی۔ وہ یہاں نہار رہا تھا اور دور حدِ نگاہ پر ربن کی طرح بل کھاتی ہوئی دھومی ندی کے آخری کنارے پر سورج بھی نہار رہا تھا۔ پھر سورج نے پانی میں ڈبکی لگائی اور دلیپ نے بھی ڈبکی لگائی اور دیر تک سانس روکے ناک اور کانوں کو اپنے ہاتھوں سے دبائے وہ پانی کے اندر دبکا رہا۔ اور جب وہ کسی طرح اپنی سانس دبا نہ سکا تو ہات چھوڑ کر پانی کی سطح کے اوپر آ گیا اور اس کے سینے سے سانس کا دھارا یوں چھوٹا جیسے تہ آب پر آتے ہوئے وہیل مچھلی کے منہ سے پانی کا فوارہ چھوٹتا ہے۔ دلیپ نے سوچا۔ کچھ اسی طرح سے وہیل مچھلی کو بھی محسوس ہوتا ہوگا۔ جب سمندر کے نیچے اس کا سانس رکنے لگتا ہوگا۔ فرق یہ ہے کہ میں زمین پر چلنے والا جانور ہوں اور وہ پانیوں میں تیرنے والی مچھلی۔ وہ زیادہ دیر تک سمندر کے اندر رہ سکتی ہے۔ میں چند گنے چنے لمحوں کے لیے رہ سکتا ہوں۔ مچھلی سے انسان بننے میں مجھے لاکھوں برس لگے ہیں۔ کتنے سو لاکھ برس یہ تو مجھے یاد نہیں۔ مگر وہ دن مجھے یاد ہے جب میں پانی میں ایک چھوٹا سا خلیہ تھا۔ یا ایک امیّبا تھا۔ یا ایک مچھلی تھا اور زندگی کی اولین تگ و دو میں عقلیت سے زیادہ جبلت سے کام لے کر زندہ تھا۔ عقل تو بہت بعد میں آئی اور لاکھوں برسوں کی غلطیوں کے بعد آئی۔ شروع میں تو محض ایک اندھی جبلت تھی اور اس کے اندر کوئی منطق نہ تھی۔ جیسے آج بھی بہت سے انسانوں کے اندر کوئی منطق نہیں ہوتی۔ عقلیت نہیں ہوتی محض ایک اندھی جبلت ہوتی ہے۔ جس کے سہارے وہ کسی نہ کسی طرح جیتے جاتے ہیں۔ مچھلیوں کی طرح! منہ کھول کر اپنے سے ایک چھوٹی مچھلی کو کھا جاتے ہیں اور اطمینان سے چند لمحوں یا چند گھنٹوں تک اپنے ماحول کے پانیوں میں سکھ کا سانس لے کر تیرتے رہتے ہیں۔ پھر ایک بڑی مچھلی آتی ہے اور انہیں کھا جاتی ہے اور مرتے دم انہیں اپنے ماحول کی منطق کا اندازہ نہیں ہوتا۔ جب تک وہ جیئے انہیں یہ

معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس کالو الہ چھین کر جیئے اور جب وہ مرے تو انہیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس کالو الہ ہو کر مرے۔ بس وہ تو وہ اپنی اندھی جبلت کے سہارے اپنے ماحول کے پتلے گہرے پانیوں میں مچھلی کی طرح جیئے۔ حالانکہ وہ خشکی پر تھے اور انسان تھے۔ اور ان کے پرکھوں نے جنہوں نے لاکھوں برس کی جانکاہ کاوش اور جدوجہد کے بعد انہیں ارتقا کی بلند منزلوں کو طے کراتے ہوئے انسان بنایا تھا۔ انہوں نے کبھی ان سے یہ توقع نہیں کی تھی کہ وہ انسان ہوتے ہوئے مچھلیوں کی سی ذہنیت کا مظاہرہ کریں گے؟

جب سورج غروب ہو گیا تو دھومی ندی کے پانیوں میں گویا گلال گھل گیا۔ ہوا دور سے کہیں بوئے ہوئے چاولوں کی خوشبو لانے لگی۔ بادل گلابی ہو گئے دور اونچا دھن تال کا بند تھا اور اس کی مضبوط دیواریں اور دیواروں کے نیچے پالن گڈھ کے گاؤں تک آتا ہوا راستہ ایک دھندلے اور نارنجی غبار میں کھو گیا........ یہ خوب صورتی کیا ایک مچھلی سمجھ سکتی ہے؟۔ دلیپ سوچنے لگا۔ میں پیٹ اور روٹی کی بات نہیں کرتا........ نہر کاٹنے کی بات نہیں کرتا۔ زندگی کی بنیادی جدّوجہد کی بات نہیں کرتا لیکن — خوب صورتی کو سمجھنے کے لئے بھی انسان بننا ضروری ہے، کہ نہیں۔؟

وہ اکیلا تھا اس لئے دیر تک ندی میں اکیلا نہاتا رہا، اور اپنے آپ سے گفتگو کرتا رہا، کیونکہ اب اس کا کوئی ساتھی نہ رہا تھا اور وہ بالکل اکیلا تھا اس لئے وہ دیر تک پانی میں نہاتا رہا اور جب ٹیلوں کے سائے بہت لمبے ہو گئے اور نارنجی بادل سرمئی ہونے لگے اور ندی کا نیم گرم پانی خنک ہونے لگا تو وہ پانی سے باہر نکلا۔ ایک پتھر پہ بیٹھ کر اس نے اپنے جسم کو سکھایا اور پھر کپڑے پہن کر اپنے چھپر کی طرف روانہ ہو گیا۔

دوسرے دن طلوع آفتاب سے قبل وہ پھر ندی کے کنارے پہونچ گیا اور کدال لے کر نہر کا راستہ بنانے لگا۔ اس نہر کا راستہ برسوں سے اس نے اپنے ذہن میں بنا رکھا تھا اور گو یہ نہر ابھی تک کہیں نہیں تھی سوائے اس ذہن کے۔ مگر وہ اس نہر کے چپّے چپّے سے واقف تھا اور وہ ندی کے کنارے سے کھیتوں تک انگلی دوڑا کر بتا سکتا تھا کہ نہر کدھر سے کدھر تک جائے گی اور کیسے جائے گی اور کن کن ٹیلوں کو کاٹ کے جائے گی اور کھیتوں کی کس مینڈھ سے اور درختوں کی کس قطار کو چھو کر جائے گی۔ اس کی ابتدا کہاں سے ہوگی اور انتہا کہاں پر۔ خالق اپنی تخلیق کی ابتدا اور انتہا دونوں کو جانتا ہے۔ شاید وہ اس کے مقصد سے بھی آگاہ ہوتا ہے گو نہر کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ مگر دلیپ کو معلوم ہے۔ مگر کہیں پر شاید اپنی زندگی کے راستے پر چلتے چلتے نہر کو بھی معلوم ہو جائے کہ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ جب وہ کھیتوں میں سے گذرتی ہے۔ بیج کو ٹٹولتی ہے کونپل کو سینچتی ہے۔ ہرے ہرے پتوں کو چومتی ہے اور بالیوں سے سر اٹھائے ہوئے خوشوں کو دیکھتی ہے تو شاید اس کی سمجھ میں آتا ہے کہ تخلیق کا مقصد کیا ہے ہ آسمان کو دیکھو...... آسمان کو دیکھو......!

دوپہر ہونے کو آئی۔ دلیپ کے جسم کے انگ انگ سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ دلیپ کام کرتے کرتے بیچ میں سستا کر آسمان کو دیکھ لیتا پھر کدال لے کر سخت سپاٹ اور پتھریلی زمین کو کھودنے لگتا۔ کوئی اس کی مدد کو نہیں آیا۔ شاعر چاچا کے دو بچے ایک ٹیلے کی اوٹ میں چھپ کر اسے کام کرتے دیکھتے رہے اور جب وہ ان کے وجود سے آگاہ ہوا اور انہیں دیکھنے کے لئے مڑا تو وہ جلدی سے بھاگ گئے۔ چھوٹے چھوٹے سے بچے تھے۔ ایک سات سال کا۔ دوسرا پانچ سال کا۔ وہ دونوں واپس دوڑتے ہوئے کتنے بھلے معلوم ہوتے تھے۔!

دلیپ نے سر جھکا کر پھر کام کرنا شروع کر دیا۔ اب اس نے آسمان اور اپنے گردوپیش کی دنیا پر نگاہ ڈالنا بند کر دیا۔ بلکہ دانت بھینچ کر صرف اپنے سامنے کی چند گز زمین کے جغرافیہ پر دھیان دے کر کدال چلانے لگا۔ بہت عرصے تک صرف چند گز زمین اس کے سامنے رہی۔ ایک کدال کہیں اوپر سے آتی تھی اور زمین پر گر کر اس میں شگاف پیدا کرتی تھی۔ پھر وہ کدال سے شگاف کو پیرتا ہوا اس میں چند انچ نہر کاٹتا تھا۔ پھر کدال اوپر اٹھاتا تھا۔ پھر کہیں اوپر سے ایک کدال آتی تھی۔۔۔ کچھ عرصے تک اسی طرح کام کرتے کرتے وہ یکایک چونک گیا۔ کیونکہ اب کہیں اوپر سے ایک کدال کے بجائے دو کدالیں آئیں اور اس کی نظروں کے سامنے زمین میں گڑ گئیں اور وہ حیرت سے زمین میں ان دو کدالوں کو گرتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔ ایک کدال تو اس کی اپنی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔ مگر یہ دوسری کس کی تھی ؟

اس نے جب پلٹ کر دیکھا تو سندھیا تھی۔!

دلیپ چند لمحوں تک اس کی طرف دیکھ دیکھ کر گھورتا رہا پھر پلٹ کر کچھ کہے بغیر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس کی کدال چلنے لگی سندھیا کی بھی۔ دونوں کدالیں ساتھ ساتھ اٹھتیں اور ساتھ گرتیں۔ چند منٹ کی خاموشی کے بعد سندھیا کی طرف نگاہ اٹھائے بغیر دلیپ نے پوچھا۔

"بھاگ کر چلی گئی تھیں تو پھر واپس کیوں آئیں ؟"

"بھاگ کر نہیں گئی تھی۔ پتاجی چچا کی بیماری کا بہانہ بنا کر دھوکے سے لکھنؤ لے گئے تھے۔ بھاگ کر تو اب آئی ہوں اور پتاجی سے لڑ کر آئی ہوں !"

"پتاجی سے لڑ کر کیوں آئیں ؟"

"وہ میری شادی بلرام سنگھ سے کرنا چاہتے تھے !"

"ہوں۔" دلیپ نے کہا۔ پھر کچھ نہیں بولا۔ دیر تک خاموشی سے دونوں

کدالیں چلتی رہیں۔

پھر سندھیا نے پوچھا، "میں نے سنا ہے تم کبھی یہاں سب سے لڑ لئے اور تمہارے خاندان کے لوگ تم سے علاحدہ کبھی ہو گئے۔!"

دلیپ بولا۔" وہ مجھ سے علاحدہ ہو جائیں مگر میں ان سے علاحدہ نہیں ہو سکتا۔!"

اتنا کہہ کر وہ پھر کدال چلانے لگا۔ پھر دیر تک خاموشی رہی۔ آخر سندھیا نے پوچھ لیا۔

"کبھی میری یاد آئی۔؟"

"کبھی نہیں۔!"

"بالکل نہیں؟" اس نے پھر پوچھا

"بالکل نہیں!"

"ایک دفعہ بھی نہیں؟" سندھیا کی آواز رندھنے لگی۔

"ایک دفعہ بھی نہیں۔" دلیپ نے سیدھے سپاٹ لہجہ میں کہا۔

"کیوں؟" وہ بولی۔

دلیپ نے کہا۔" یاد تو اس کی آتی ہے جسے دل سے بھلایا جا سکے!"

سندھیا چپ ہو گئی۔ اس کا رواں رواں خوشی سے سرشار ہو گیا

یکایک اسے وہ کدال اپنے بازوؤں میں بڑی ہلکی معلوم ہونے لگی۔ وہ اسے تیزی سے چلانے لگی گویا محنت اور کام کی بڑھتی ہوئی تیزی میں وہ اپنے دل کی تیز تیز دھڑکنوں کو چھپانا چاہتی ہو۔ مگر اس کا دل ایک ڈھول کی طرح زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ اور اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ یکایک دلیپ نے اس سے پوچھا

"اب تم کہاں رہو گی؟"

"دادی ماں کے پاس!" بہت دیر کے بعد سندھیا نے جواب دیا۔

بہت دیر کے بعد دلیپ نے پھر پوچھا۔ "سب سوچ لیا ہے؟"

سندھیا نے فوراً تو کوئی جواب دیا کیونکہ اس کی کدال ایک پتھر سے ٹکرائی تھی اور اب وہ اپنی کدال سے پتھر کے نیچے کی دھرتی میں کدال سے شگاف کرکے پتھر کو ہٹانے کی فکر میں تھی۔ چند منٹوں کے بعد اس نے کھود کھود کر کدال کا زور لگا کر پتھر کو اکھاڑ کر پرے پھینک دیا۔ تو فاتحانہ انداز میں بولی۔

"ہاں اب میں نے اپنے راستے کے سب پتھر ہٹا دیئے ہیں!"

یکایک دلیپ نے اپنی کدال چھوڑ دی اور لپک کر سندھیا کو اپنی دونوں باہوں میں بھر لیا اور یکایک سندھیا کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اس کا انگ انگ خوشی سے کانپنے لگا۔ بھری دوپہر یا میں وہ ایسا ہی اندھیرا چاہتی تھی۔

٭

"ایک بات بتاؤ۔ عورت مرد کا انتخاب کیسے کرتی ہے؟"

وہ دونوں رات کے کھانے کے بعد کھلے آسمان تلے گھاس پہ لیٹے ہوئے تھے۔ سندصبا کا ہات دلیپ کے ہاتھ میں تھا۔ اور وقت تھم گیا تھا۔ اور اس وقت کائنات میں ان دونوں کے سوا اور کوئی موجود نہ تھا۔ اور دلیپ نے سندصبا کا ہات اپنے ہات میں لئے یوں محسوس کیا جیسے وہ دونوں ابتدا کی سحر میں ہوں۔ اور دنیا بنانے نکلے ہوں۔ یہی دونوں جنّت بنائیں گے اور جہنم۔ یہیں سے درد کی ابتدا ہوگی اور مسرت کی۔ یہیں سے تخلیق کی زنجیر کھینچی جائیں گی۔ کیونکہ محبت وہ پہلی کنکری ہے۔ جو آفرنیش کے تالاب میں گرتے ہی تخلیق کے حلقے بنانے شروع کر دیتی ہے اور یہ حلقے جوں جوں مرکز سے ہٹتے جاتے ہیں وسیع تر ہوتے جاتے ہیں۔ یعنی ذات سے قبیلہ۔ قبیلے سے قوم۔ قوم سے ملک۔ ملک سے دنیا اور دنیا سے کل کائنات پر محیط ہو جاتے ہیں۔

کیا سندصبا محبت کا اتنا بڑا مطلب سمجھتی ہے؟ اسی لئے اس نے یہ سوال کیا تھا۔

سندصبا دیر تک پٹ پٹ آنکھیں کھول کے دیر تک آسمان کو دیکھتی رہی۔

اس کا چہرہ بے حد سنجیدہ تھا۔ آسمان کو دیکھتے ہوئے بولی۔ جیسے وہ دلیپ سے نہیں آسمان سے مخاطب ہو۔

"اب کیا کہوں تم سے ـــــ اس سوال کے جواب میں ـــــ بہت سی عورتوں کے لئے تو کبھی کوئی انتخاب نہیں رہا۔ تاریخ کی تاریک صدیوں میں وہ ایک ریوڑ کی طرح ہانکی گئی ہیں اور بڑی سے بڑی شہزادی کی حیثیت بھی ایک حبشی غلام سے زیادہ نہ تھی۔ خوبصورت القاب اور خوبصورت زیوروں کے باوجود ان کی حالت قابل رحم تھی۔ جہاں تک کہ انتخاب کا تعلق ہے۔ آج بھی میرے پتاجی نے مجھ سے یہی چاہا کہ وہ میرے لئے انتخاب کریں ایک مرد کا۔ وہی شرائط طے کریں۔ تاریخ بتائیں اور مقررہ تاریخ کو سیج سجائیں۔ میرا کام صرف بستر پر سو جاتا ہے۔ سمجھتے ہو؟ اس لئے بہت سی عورتوں کے لئے۔ یہ کوئی سوال نہیں ہے کہ وہ اپنے مرد کا انتخاب کیسے کرتی ہیں۔ جواب یہ ہے کہ وہ انتخاب ہی نہیں کرتی ہیں۔ کیونکہ انہیں اس کا موقع ہی نہیں دیا جاتا۔"

"مگر تم۔۔۔۔۔۔؟" دلیپ نے کہا۔

"مصیبت یہ ہے کہ عورت سے عشق کیا جاتا ہے۔ عورت کو عشق کا موقع ہی نہیں دیا جاتا۔" سندھیا بولی۔ "میرے لئے عشق ایک پروٹسٹ تھا۔ اپنے ماحول کے خلاف اور اس سے پہلے میرا عشق ایک قسم کی ناپسندیدہ شے تھی۔ کیونکہ میں نے شروع میں تمہیں پسند نہیں کیا۔ میں تمہیں ناپسند کرتی تھی۔ شاید میرے عشق کی یہی وجہ تھی کہ مجھے تم سے نفرت سی تھی۔ تم سے، تمہارے ماحول سے، تمہارے غریب دیہات سے۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ مجھے تم سے نفرت نہیں ہے۔ تمہاری غریبی سے ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ تم کس طرح اس غریبی کا مقابلہ کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ میرے دل میں تمہارے لئے ہمدردی پیدا ہوئی۔ ہمدردی اور عزت

ہمدردی تمہارے خیالوں سے۔ عزت تمہاری ذات کے لئے۔ میرے لئے تمہاری ذات بہت اہم ہے۔ تم اسے نہیں سمجھ سکو گے۔ کبھی کوئی مرد اس بات کو نہیں سمجھ سکتا۔ کہ اس کی ذات اس کی عورت کے لئے کس قدر اہم ہوتی ہے۔ تمہارے بھیجے کے بے ہنگم خیال سے لے کر تمہاری ناک کے دائیں طرف کے تِل تک۔ یہ سب باتیں ایک عورت کے لئے کس قدر اہم ہیں۔ مرد کی دنیا بہت وسیع ہوتی ہے۔ وہ پھیل کر دیکھتا ہے۔ عورت سمٹ کر دیکھتی ہے۔ مرد حلقے کو وسیع کرتا ہے۔ عورت مرکز بہم پہونچاتی ہے۔ جس طرح ایک سائنس داں ایک خلیئے میں ساری کائنات دیکھتا ہے۔ اس طرح عورت ایک مرد کی ذات میں کل حیات دیکھتی ہے۔ اسے احمق مت سمجھو۔ دنیا کو سمجھنے کے لئے اس کے اپنے طریقے ہیں۔ کیونکہ وہ عورت ہے اور مرد سے مختلف ہے۔ میں خود تمہارے پاس آئی ہوں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں تمہاری کسی غلطی پر تم سے لڑوں گی نہیں!"

"تم نے تو ابھی سے لڑنا شروع کر دیا۔" دلیپ نے ہنس کر کہا۔

سندھیا بھی ہنسی۔ مسکرا کر اس نے دلیپ کے ہاتھ کو زور سے پکڑ لیا۔ بولی۔

"مجھے معلوم نہیں۔ میں نے تمہیں کیوں پسند کر لیا۔ تم ضدی ہو، ہیکڑی باز ہو۔ اپنی دھن کے پکے ہو۔ تمہاری آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی معصوم حماقت ہے۔ جو صرف فرشتوں اور خواب دیکھنے والوں کو عطا ہوتی ہے۔ تمہارے بازوؤں میں طاقت ہے۔ تمہاری مسکراہٹ میں ایک عجیب سا منظر ہے۔ تم بہت جدوجہد کر سکتے ہو۔ تم جب چلتے ہو تو تمہاری لانبی پرُ وقار گردن مجھے بہت اہم معلوم ہوتی ہے۔ اور تمہاری چال میں کیسی روانی معلوم ہے جیسے دھومی ندی تمہارے اندر بہہ رہی ہو۔"

اس نے تین چار بار تیز تیز سانس اندر کھینچ کر دلیپ کے سینے کو سونگھا۔

پھر بے قرار ہو کر وہ اس کے سینے سے لپٹ گئی اور کانپ کانپ کر اس کی ٹھوڑی۔ گال اور ہونٹوں کو چومنے لگی۔

"میرے محبوب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے محبوب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔!"

دلیپ نے سوچا۔ "میں دھومی ندی ہوں تو تم وہ نہر ہو جو میکے سے کٹ کے آئی ہے۔ میری زندگی کو سیراب کرنے کے لیے۔ تم نہ ہوتیں تو کوئی دل گداز نہ ہوتا کوئی کونپل نہ پھوٹتی۔ کوئی جذبہ ہرا نہ ہوتا۔ کوئی مرد کبھی اپنے گھر کو نہ لوٹتا۔ ۔ ۔ ۔"

سکھ کا ایک لمبا سانس لے کر دلیپ نے سندھیا کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ یکایک ان کے چاروں طرف رات گہری ہوتی گئی۔

اگلے دو روز میں سندھیا اور دلیپ نے کئی گز نہر کھود ڈالی اور ایک ٹیلے کو بھی صاف کر دیا۔ مگر ابھی بہت سارا رستہ باقی تھا۔ چند گز پانی کو سانپ کی طرح نہر میں سرکتے دیکھ کر جب لمبے لمبے بنجر کھیتوں کا خیال آتا تو دلیپ کا چہرہ کام کرتے کرتے افسردہ ہو جاتا اور پھر وہ اپنی افسردگی کو اپنے سینے میں دبا کر کام میں جٹ جاتا۔

اسی شام کو جب وہ اور سندھیا دونوں ندی سے واپس آتے ہوئے دادی ماں کی کھاٹ کے قریب پہونچے پیپل کے تنے پر چند منٹ کے لیے بیٹھ گئے تو دادی ماں نے پوچھا۔

"جس طرح تم دونوں مل کر کام کرتے ہو اسی طرح کرتے رہے تو کتنے دن میں نہر کھود لوگے ؟"

"تین مہینے تو لگ ہی جائیں گے۔" دلیپ بولا۔

"جب تک فصل کا کیا ہوگا؟" دادی ماں نے سوچ سوچ کر دوسرا سوال کیا۔

سندھیا بولی۔ "یہ اپنے گھر کے دوسروں لوگوں سے پوچھیئے ناں۔ دادی ماں!"

دادی ماں بہت دیر تک چپ رہیں۔ کچھ نہیں بولیں۔ پیپل کے پتے ہولے ہولے سرسراتے رہے۔ اور شام بڑھتی رہی۔ پھر پرکھوی راج کی بیوی ایک لمبا گھونگھٹ کاڑھے دادی ماں کی کھاٹ کے پاس کھانے کی ایک تھالی اٹھائے ہوئے آئی۔ وہ تھالی کو دادی ماں کی کھاٹ پر رکھنے ہی کو تھی کہ دادی ماں نے یکلخت کڑے لہجہ میں ٹوک دیا۔

"لے جا۔ میں نہیں کھاؤں گی۔"

"مگر دادی ماں . . . ." گھونگھٹ کے اندر سے دوسری عورت کمزور اور سہمے ہوئے لہجہ میں بولی۔

"کہہ جو دیا۔ بھوک نہیں ہے۔"

دلیپ اور سندھیا نے بہت زور دیا۔ مگر دادی ماں نے انکار کر دیا تھا اور اب وہ اپنے منہ پر لحاف رکھ کر گویا دنیا جہان سے بے خبر ہو کر لیٹ گئی تھیں پرکھوی راج کی بیوی مایوس ہو کر بھری تھالی لے کر پلٹ گئی۔

تھوڑی دیر میں جب خاندان کے لوگوں کو پتہ چلا کہ دادی ماں نے بھوک ہڑتال کر دی ہے تو لوگ جوق در جوق جمع ہونا شروع ہوئے اور سب نے آ کے دادی ماں کے پاؤں چھونا شروع کئے اور منت سماجت کی اور کھانا کھانے کے لئے ہر کوئی اصرار کرنے لگا۔ ہولے ہولے سارا خاندان ان کی چارپائی کے گرد جمع

ہو گیا۔ مگر دادی ماں سب کو انکار کیے جاتی تھیں۔

بڑے ٹھاکر کنور سنگھ بولے۔ "پہلے ہی سے آپ بیمار اور کمزور ہیں۔ اس پر کھانا بھی نہ کھائیں گی تو آپ کی جان کا کیا ہوگا؟"

"کون جینا چاہتا ہے؟" دادی ماں نے اپنے چہرے سے پلّو ہٹا کر پوچھا۔

"خدمت کیجئے۔ تھوڑا سا کھا لیجئے۔" جرنیل چاچا نے منت کی۔

"نہیں کھاؤں گی۔ بالکل نہیں کھاؤں گی۔"

دادی ماں نے یہ کہہ کر اپنے چہرے پر پلّو لے لیا۔

اب شاعر چاچا بولے۔ "بس ایک نوالہ کھا لیجئے۔"

دادی ماں نے پھر اپنے چہرے سے پلّو ہٹا دیا اور کڑک کر بولیں۔ "ایک نوالہ تک نہیں۔ کہہ جو دیا۔"

"مگر کیوں؟" بڑے ٹھاکر پوچھنے لگے۔

دادی ماں چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ "سب جانتے ہو۔ پھر بھی پوچھنا چاہتے ہو؟۔ تو سنو۔"

یہ کہہ کر وہ یکایک چارپائی سے اتر کر زمین پر کھڑی ہو گئیں۔ جانے اس وقت ان کے بدن میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔ انہوں نے جھک کر زمین سے مٹی کا ایک ڈھیلا اٹھا لیا اور اسے سب کو دکھاتے ہوئے بولیں۔

"اسے دیکھتے ہو۔ یہ دھرتی ہے۔ میری بہن۔ میری بڑی بہن۔ اسی سال سے میرا اس کا ساتھ رہا ہے۔ جس دن میں پیدا ہوئی اس دن سے میری اس بہن نے مجھے اپنی گود میں کھلایا ہے۔ اپنے سینے کا دودھ مجھے پلایا ہے۔ اس نے مجھے گھر دیا۔ اور پتی دیا۔ بچے بالے پوتے پڑپوتے دیے اور میری جھولی کو خوشیوں اور مرادوں سے بھر دیا۔ اسی سال سے میں اس بہن کا سہاگ اجڑتے دیکھ رہی

ہوں۔ دھیرے دھیرے تم نے اسے بیچا۔ بیچ بیچ کر نوچا۔ نوچ کر کھسوٹا اور کھسوٹ کر دروپدی کی طرح ننگا کر دیا۔

آج یہ دھرتی مجھ سے انصاف چاہتی ہے۔ آج میری بہن بھوکی ننگی اور پیاسی ہے۔ کیونکہ وہ بیٹے جو کبھی اس کا غرور تھے۔ اس کا مان تھے۔ اس کے جیون کا سب سے بڑا سہارا تھے۔ وہ نکمّے نکل گئے۔ اور آوارہ۔ نکھٹو۔ اوباش۔ لفنگے اور بدمعاش بن گئے۔ اور تم چاہتے ہو میں کھانا کھالوں۔ اپنی بہن کو مرتے ہوئے دیکھوں اور خود کھانا کھالوں۔ یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ یاد رکھو۔ جب تک میری بہن بھوکی ہے۔ میں بھوکی رہوں گی۔ جب تک وہ پیاسی ہے۔ میں بھی پیاسی رہوں گی۔ جب تک اس دھرتی پر پانی کی نہر نہیں آجائے گی۔ میرے منہ میں کھانے کی ایک کھیل اڑکر نہیں جائے گی۔!"

بوڑھی دادی ماں کا ایسا لال چہرہ کسی نے نہ دیکھا تھا۔ وہ غصّے سے تمتماتے ہوئے چہرے سے چاروں طرف اپنے خاندان والوں کو دیکھ رہی تھیں۔ جن کے سر جھکے ہوئے تھے۔ اور جو اس وقت بالکل خاموش تھے۔ دادی ماں نے مٹی کے ڈھیلے کو دونوں ہاتھوں سے اپنے سینے سے لگا لیا اور چارپائی پر گر، بچوں کی طرح رونے لگیں۔

دوسری صبح پہلے دو تین گھنٹے تو دلیپ اور سندھیا اکیلے کام کرتے رہے۔ پھر یکایک دو کدالوں کے بجائے چار کدالیں چلنے لگیں۔ شاعر چاچا کے دونوں بچے کہیں سے چھوٹی چھوٹی کدالیں لے کر چلے آئے تھے اور دلیپ سے

کچھ کہے سنے بغیر کام میں جٹ گئے تھے۔ دلیپ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ سندھیا اور دلیپ دونوں نے باری باری دونوں بچوں کو ہوا میں لہرایا۔ چوما پیار کیا۔ پھر انہیں کدالیں چلانے کے بجائے نہر سے مٹی نکالنے کے کام پر معمور کر دیا۔ کیونکہ وہ دونوں بہت چھوٹے چھوٹے بچے تھے اور کدال نہیں چلا سکتے تھے۔

ان دونوں بچوں کو کام کرتے دیکھ کر پرتھوی راج پتنگ باز کے بچوں کو بھی شوق چرایا اور دوپہر تک وہ لوگ بھی آ دھمکے اور آہستہ آہستہ سہ پہر تک سارے خاندان کے بچے بالے کدالیں اٹھائے ٹوکریاں لئے نہر پہ کام کر رہے تھے۔

سہ پہر میں بید جی نے گاؤں سے آکر دادی ماں کی نبض دیکھی۔ بڑی ٹھکرائن کو بولے سے بتایا کہ اگر دادی ماں نے کھانا نہیں کھایا۔ اسی طرح سے اَن جل کو ہاتھ نہیں لگایا تو دو دن سے زیادہ نہیں چل سکیں گی۔"

یہ سن کر بڑی ٹھکرائن سنّاٹے میں آگئیں وہ دوڑی دوڑی خاندان کی دوسری عورتوں کے پاس گئیں۔ عورتیں سر جوڑ کر رونے لگیں اور جب رو چکیں تو سرگوشیوں میں سازش کرنے لگیں۔ کانوں کان ایک سے کہتے دوسری کی سنتے۔ انہوں نے اپنی سازش مکمل کر لی۔

جب دن ڈھل رہا تھا اور دلیپ کام کرنے کی سوچ رہا تھا تو وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ عورتوں کا ایک قافلہ کاندھے پر کدالیں اٹھائے، ٹوکریاں سنبھالے لالٹین لٹکائے گیت گاتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ قافلہ جب قریب پہونچا تو دلیپ یہ دیکھ کر بھونچکا رہ گیا کہ یہ سب عورتیں اس کے اپنے خاندان کی عورتیں تھیں جنہوں نے کبھی ایک تنکا توڑ کر نہیں دیا تھا وہ سب اس وقت پرے کے پرے باندھے

جوشیلے گیت گاتی ہوئیں اس کی طرف چلی آرہی تھیں۔

قریب آکر وہ رک گئیں۔ بڑی ٹھکرائن آگے بڑھ کر بولیں۔

"ہم نے بھی قسم کھائی ہے۔ جب تک دادی ماں ان جل کو ہاتھ نہیں لگائیں گی۔ ہم بھی کھانا نہیں کھائیں گی۔ آج رات سے کھانا نہیں پکے گا۔ جس کو کام نہیں کرنا ہے، نہ کرے۔ مگر آج سے کھانا کسی کو نہیں ملے گا اور اس وقت تک نہیں ملے گا جب تک نہر کا پانی دادی ماں کے چرنوں کو نہیں چھو لے گا۔"

"دھومی میّا کی جے۔ دھومی میّا کی جے۔" کہتی ہوئیں سنگرا ماخاندان کی عورتیں کدالیں اور ٹوکریاں لے کر نہر کھودنے کے کام میں جٹ گئیں۔ اور دلیپ کو بتایا گیا کہ اب کام ایک پل کے لئے نہیں رکے گا۔ لالٹینوں کی روشنی میں ساری رات ہوگا۔ اگر ایک فرد تھک جائے گا تو دوسرا اس کی جگہ آجائے گا۔ مگر کام اب ایک پل کے لئے نہیں رکے گا۔!"

کوئی دس گیارہ بجے کے قریب بالن گڑھ کے گاؤں میں ہلّہ ہوا۔ کھانا کھانے کے بعد گاؤں کے سارے کسان ایک چوپال میں جمع ہوئے اور ٹھاکروں کے فارم کی طرف بڑھنے لگے۔ ڈھول بجاتے، گیت گاتے ہوئے۔ جب وہ ٹھاکروں کے فارم پر پہونچ گئے تو انہوں نے ٹھاکر کنور سنگھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

ٹھاکر کنور سنگھ اس وقت شاعر چاچا کے ساتھ بظاہر شطرنج کھیلنے میں مصروف تھے۔ کسانوں کو اپنے گرد جمع ہوتے دیکھ کر بھی انہوں نے بازی سے

سر اوپر نہیں اٹھایا۔ شطرنج کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

"کیا بات ہے۔ ؟"

ٹھاکر کنور سنگھ کے لہجہ میں بڑی سختی تھی۔ یکایک چہ میگوئیاں کرتے ہوئے کسان چپ ہو گئے۔ اور ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ یہاں تک تو آ گئے تھے مگر اب کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ آگے بات چلائے۔ ایک دوسرے سے اشارے کرتے تھے۔ ایک دوسرے کو کہنیاں مارتے تھے۔ مگر کوئی آگے نہیں بڑھتا تھا۔

آخر ٹھاکر کنور سنگھ غصّے سے چلّائے۔

"اس وقت آدھی رات کو تم لوگ یہاں کیوں آئے ہو؟"

ایک نوجوان کسان گلے میں چادر ڈالے آگے بڑھا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا۔" بڑے ٹھاکر ہم گاؤں کے لوگ آپ سے ایک بات پوچھنے کو آئے ہیں!"

"بولو۔ بولو۔ بات کیا ہے؟"

"وہ بات پوچھتے ہوئے ڈر بھی لگتا ہے۔ شرم بھی آتی ہے۔ لاج بھی آتی ہے۔!"

"جب یہاں تک چلے آئے ہو تو اب ڈر اور شرم کیسی؟" بڑے ٹھاکر کسی قدر نرم ہو کر بولے۔" پوچھ لو۔!"

"مالک۔ ہم یہ پوچھنے آئے ہیں، دادی ماں کی ارتھی کب اٹھے گی؟"

یہ سن کر بڑا ٹھاکر یکایک کانپ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا ہات فوراً ایک کسان کی لاٹھی پر گیا۔ غصّے سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ مگر جب اس نے ہر کسان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو اس کا ہات آپ ہی آپ کسان کی لاٹھی سے ہٹ گیا۔ اس کا سر جھک گیا۔ آپ ہی آپ، اور آپ ہی آپ پھر بلند ہوا۔ ایک چوٹ کھائے

ہوئے سانپ کی طرح۔ اس نے جلدی سے ایک کسان کے ہات سے کدال چھین لی اور غصّے سے بولا۔

"دادی ماں کی ارتھی۔ ہ کیا بکتے ہو۔ دادی ماں اتنی آسانی سے نہیں مریں گی۔ ابھی ان کے بیٹے زندہ ہیں۔!"

یہ کہہ کر بڑا ٹھاکر کدال اٹھائے بھیڑ چیر کر مڑا۔ اور تیز تیز قدموں سے نہر کی جانب دوڑنے لگا۔ اسے دوڑتے دیکھ کر پہلے شاعر چاچا نے بھی ایک کدال سنبھال لی۔ اور بھاگنے لگے۔ چند لمحوں میں جرنیل چاچا۔ پرتھوی راج۔ مہیندر سنگھ اور جوگیندر سنگھ اور خاندان کے دوسرے فرد کدالیں اٹھائے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگے جا رہے تھے۔

گاؤں کے کسانوں کے چہرے پر مسرّت اور شادمانی کی مسکراہٹ آ ئی انہوں نے ایک دوسرے کی طرف چمکتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ پھر سینکڑوں لوگوں نے ہات اوپر اٹھاکر "دھومی میّا کی جے" کا نعرہ لگایا اور ٹھاکروں کے پیچھے دوڑ پڑے........

رات بھر کدالیں چلتی رہیں۔ ٹیلے کٹتے رہے۔ نہر بنتی رہی۔ ٹوکریوں میں بھر بھر کر مٹّی نہر سے ہٹائی جاتی رہی۔ اور نہر کا پانی لمحہ بہ لمحہ کھیتوں کے قریب پہونچتا گیا۔ کھیتوں میں سے گذرنے لگا۔ گاؤں کا ہر فرد و بشر کام کر رہا تھا۔ ٹھاکروں کے خاندان کا ہر فرد اپنے جسم کی پوری طاقت سے نہر بنانے میں منہمک تھا۔ جب صبح ہوئی تو بھی کسی نے آرام نہیں کیا۔ صبح ہوئی۔ دوپہر گذر گیا۔ پانی کا ریلا آگے آگے بڑھتا رہا۔ کبھی ہولے ہولے۔ کبھی تیز تیز۔ پیاسی مٹّی کے ہونٹ پہلے تو پانی کو ایک لوہے کی طرح چوس لیتے۔ پھر سیراب ہو کر دھرتی کے ہونٹ کھل جاتے۔ اور پانی کو آگے راستہ مل جاتا۔ سرِ شام جب آفتاب غروب ہونے

لگا۔ پانی کا ریلا پیپل کے پیڑ کے قریب آتا گیا۔ حالانکہ اُدھر سے نہر کے نکالنے کا کوئی خیال نہ تھا۔ مگر گاؤں کے کسانوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اس نہر کو دادی ماں کے قدموں کے نیچے سے نکال کے لے جائیں گے۔

دادی ماں اٹھ کر وہ بید جی کا سہارا لے کر چارپائی پر بیٹھ گئی تھیں اور روتی جاتی تھیں اور آنسو پونچھتی جاتی تھی اور پانی کو اپنے قریب آتے دیکھ کر اس طرح خوش ہو ہو کر دیکھتی جاتی تھیں۔ جیسے ماں اپنے بچّے کو پہلی بار دھرتی پر قدم اٹھاتے دیکھتی ہے۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ پھیلا پھیلا کر پانی کو دعائیں دیتی جاتی تھیں جیسے وہ کوئی پانی کا ریلا نہ ہو ایک چھوٹا سا خوبصورت بچّہ ہو۔ جو ہمک ہمک کر ان کی گود میں آنے کے لئے بیتاب ہو اور جسے گود میں لینے کے لئے خود ان کی مامتا بھی بیقرار ہو۔!

ان کے ہاتھ پانی کی جانب اٹھے ہوئے تھے اور پتلی منحنی ٹانگیں کھاٹ سے نیچے لٹک رہی تھیں۔

کدالوں کے چند زوردار حملوں کے بعد پانی کا ایک تیز ریلا آگے بڑھا اور دادی ماں کے قدموں کو چھوتا ہوا پلنگ کے نیچے سے چلا گیا۔

"دادی ماں کی جے!"

"دھومی میّا کی جے!"

سینکڑوں کدالیں ہوا میں ایک ساتھ لہرانے لگیں۔ جوشیلے۔ محبت بھرے۔ امیدوں سے معمور گیت سینکڑوں گلوں سے پھوٹ پڑے۔ کسان اور ٹھاکروں کے خاندان کے افراد ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر دادی ماں کی کھاٹ کے گرد ناچنے لگے۔ اب گاؤں والوں میں اور ٹھاکروں میں کسی طرح کا بھید اور فرق نہ تھا۔ کسانوں کے ساتھ کام کر کے ٹھاکروں نے

اپنی نئی ذات حاصل کی تھی۔

رات کے خاموش اندھیرے میں سندھیا نے دلیپ سے کہا۔ "اتنا تو طے ہو گیا کہ انسان سے مایوس ہونے کی ابھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

دلیپ بولا۔ "انسان کی سب سے بڑی طاقت اس کی نیکی ہے اور بدی اسکی سب سے بڑی مجبوری ______ انسان فطرتاً نیک ہے اور عادتاً بد۔ عادتیں بدلی جا سکتی ہیں لیکن فطرت کو بدلنا بہت مشکل ہے۔ اس لئے میں انسان کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ اور شیطان پر رحم کھاتا ہوں۔"

"کیونکہ سوئے ہوئے لوگ جگائے بھی جا سکتے ہیں۔" سندھیا بولی۔

دلیپ بولا۔ "ہاں لوگ جاگتے ہیں۔ مگر جاگ کر پھر سو جاتے ہیں اور نیند میں بیچ دیئے جاتے ہیں۔ مگر وہ پھر جاگتے ہیں اور پھر اپنے ارادوں کی تکمیل میں لگ جاتے ہیں۔ بالآخر ان لوگوں کو دھوکا دینا بہت مشکل ہے۔ یہ لوگ جو ایک غلطی سے دوسری غلطی کرتے ہیں۔ جاگیرداری کو ختم کرتے ہیں اور سرمایہ داری کا ظلم سہتے ہیں پھر زار کو مارتے ہیں اور اس کی جگہ سٹالن کو بٹھا دیتے ہیں۔ مگر کسی نہ کسی طرح کیچڑ اور فریب، جھوٹ اور بھوک، گہری دھند اور کہرے اور آدھے علم اور آدھی جہالت کے درمیان وہ آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ سادہ لوح غلطی کرنے والے لوگ بڑے پیارے ہیں۔ یہ لوگ جو دھرتی کا بیج۔ سمندر کا نمک۔ درخت کی جڑ اور دھنک کے ساتوں رنگ ہیں۔ اس نظام شمسی پر زمین زندگی کا ناحد علم ہیں۔! ان لوگوں سے الگ رہ کر

موت اور مایوسی ممکن ہے۔ زندگی اور امید تو ممکن نہیں ہے! سن رہی ہو؟"
جواب میں اسے سندھیا کے ہلکے ہلکے خراٹے سنائی دیئے۔ وہ دن بھر کی تھکن سے چور ہو کر نڈھال ہو کر پڑی تھی۔ دلیپ آہستہ سے فرش کے پیال پر اس کے قریب سرکتا گیا۔ پھر اس نے دھیرے سے اپنے گال سندھیا کے گال سے لگا دیئے اور پانی کی پتلی لہر کی طرح نرم لہجہ میں کہنے لگا۔
"تمہارے گال کیسے نرم ہیں جیسے پھولوں کو نیند آجائے!"
سندھیا اس کے لمس سے بیدار ہو گئی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں آہستہ سے کھلیں۔ وہ بڑی بڑی آنکھیں جن سے سیاہ رات بنتی ہے۔ اور جن کی گھنیری چھاؤں میں تمناؤں کی خوشبوئیں سرکتی ہیں۔ آہستہ سے کھل کھل کر دلیپ کو دیکھنے لگیں۔
دلیپ ان آنکھوں کی طرف دیکھ کر آہستہ سے بولا۔
"تمہاری آنکھیں کیسی مہربان جیسے جھیلوں کو راستہ مل جائے!"
سندھیا آہستہ سے مسکرا دی۔ تھکن سے چور اس کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ سوتے سوتے میں اس کا چہرہ مسکراتا رہا۔ دلیپ ایک شاعرانہ جذبے سے مسحور ہو کر دیر تک اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ وہ چہرہ جو دلیپ کے وجود کو اپنے قریب اس قدر پاکر خود بخود مسکرا رہا تھا۔ اپنی روشنی سے تو ہر شمع جلتی ہے۔ لیکن دوسروں کے نور سے صرف عورت کھلتی ہے۔ دلیپ نے سوئی سندھیا کی انگلیاں اٹھا کر اپنے ہونٹوں پر رکھ لیں اور انہیں آہستہ سے چومنے لگا۔

دوسرے دن صبح دلیپ گرفتار کرلیا گیا۔ اس پر سندھیا کو اغوا کر کے اسے حراستِ بیجا میں رکھنے کا الزام تھا۔ پولیس کے ساتھ ساتھ سیٹھ دھنپت رائے خود آیا تھا۔ اور بلرام سنگھ بھی۔ پولیس نے سندھیا کو اس کے باپ کے حوالے کردیا۔ سندھیا بہت روئی، بیٹی۔ چلائی۔ کہنے لگی۔ میں اپنے باپ کے ساتھ جانا نہیں چاہتی۔ یہ میری شادی کسی دوسری جگہ کرنا چاہتے ہیں۔ مگر پولیس نے کہا۔ یہ سب باتیں آپ کورٹ میں کہہ سکتی ہیں۔ دلیپ کے لئے چودہ دن کا ریمانڈ پولیس نے لے لیا اور اس کی ضمانت کی درخواست بھی نامنظور ہوگئی۔ اس لئے دلیپ حوالات میں رکھ دیا گیا اور سندھیا اپنے باپ کے پاس پہونچا دی گئی۔ اور یہ سب کچھ ایک دن میں نہیں بلکہ چند گھنٹوں میں ہوگیا۔

. . . .

رات کے کھانے کے بعد سیٹھ دھنپت رائے نے اپنی اکلوتی بیٹی کو پھر بڑے پیار سے سمجھایا۔ زندگی کی ساری اونچ نیچ سمجھائی۔ بلرام سنگھ سے شادی کرنے پر اصرار کیا اور آخر میں آنکھوں میں آنسو لاکر بولا۔ میں بڈھا ہوچلا ہوں۔ تو ایک لڑکی ہے۔ اس مل کو چلانے کے لئے مجھے ایک قابل داماد

کی ضرورت ہے۔ بلرام سنگھ نوجوان ہے۔ محنتی ہے۔ اچھے کیریکٹر کا انسان ہے۔ اتنے سالوں سے وہ میری مل کا کام سنبھالے ہوئے ہے۔ میں اسے اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھ چکا ہوں۔

سندھیا کو اچانک کارلٹن ہوٹل کی ایک رات یاد آئی جب اس نے اپنے باپ کے کمرے کی طرف جاتے جاتے کوریڈور میں کھڑے ٹھیکیدار گردھر شاہ کو سو سو کے نوٹوں کی ایک بڑی گڈی چپکے سے ٹھاکر بلرام سنگھ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ پورا معاملہ چند سیکنڈ میں ختم ہو گیا تھا نوٹ ایک جیب سے نکلے تھے اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ دوسری جیب میں چلے گئے تھے اور جب وہ ان کے قریب سے گذری تو ٹھاکر بلرام سنگھ اور ٹھیکیدار گردھر شاہ دونوں سگریٹ سلگا رہے تھے اور سگریٹ سلگا کر مل کے ایکسٹینشن کی باتیں کر رہے تھے کہ مل کے آس پاس کی زمین صاف کرنے میں اور ٹیلوں کو توڑنے میں کتنا ڈائنامنٹ صرف ہو گا۔ اور وہ اپنا کاسنی رنگ کا اطلسی غرارہ جھلاتی ہوئی یوں کمال لاپرواہی سے ان کے قریب سے گذر گئی تھی جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ اور ان دونوں نے اسے اچانک اپنے قریب سے گذرتے دیکھ کر یوں مؤدب ہو کر سلام کیا تھا جیسے اچانک ابھی ابھی انہوں نے اسے دیکھ لیا ہو۔!

اس وقت تو سندھیا نے اس معاملے کو دل ہی دل میں رکھ لیا تھا۔ مگر اس وقت جب دھنپت رائے ٹھاکر بلرام سنگھ کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے لگا تو سندھیا کو مناسب محسوس ہوا کہ اس واقعے کا ذکر کرے چنانچہ اس نے بلرام سنگھ کی تعریف کے جواب میں جب اس واقعہ کا ذکر کیا تو اس کا باپ سن کر مسکرانے لگا۔ سر ہلا کے بولا۔

"مجھے معلوم ہے۔ اس نے بیس ہزار روپے کا کمیشن گردھر شاہ سے وصول کر لیا تھا۔ مِل کی ایکسٹینشن کا ٹھیکہ دینے کے سلسلے میں!"

"آپ کو معلوم ہے پھر بھی آپ اسے ایماندار کہتے ہیں؟" سندھیا حیرت سے بولی۔

"مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ابھی دو دن ہوئے جب ٹیلوں اور پہاڑیوں کو کاٹنے کے لئے ڈائنامائیٹ لایا گیا تو کام چالو کرنے سے پہلے ٹھاکر بلرام نے تیس ہزار روپے مزید ٹھیکیدار گردھر شاہ سے وصول کئے تھے۔"

سندھیا تعجب سے اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگی۔ "بلرام سنگھ نے مِل کے حساب کے سلسلے میں پچاس ہزار روپے کی ہیرا پھیری کر لی ہے اور آپ اس کو ابھی تک ایماندار سمجھتے ہیں۔"

"اس نے میرے حساب میں ہیرا پھیری نہیں کی!"

"مگر ٹھیکہ تو آپ کی مِل کا ہے!" سندھیا نے کہا۔

"درست۔ مگر ٹھیکے کا بجٹ تو میں نے پاس کیا ہے۔ اب اگر بلرام سنگھ ٹھیکیدار سے اس کی رقم میں سے اپنی رقم کا کمیشن کٹوا لیتا ہے تو اس میں بے ایمانی کی بات کیا ہے۔ اگر وہ میری جیب میں سے اپنا کمیشن کاٹتا تو بے ایمانی ہوتی۔ دوسرے کی جیب سے رقم اڑا لینا تو بے ایمانی نہیں ہے۔ یہ تو بزنس ہے۔ اور یہی تو بزنس ہے!! اور کون بزنس مین ہے جو ایسا نہیں کرتا۔ اپنی جیب محفوظ رکھ کر دوسروں کی جیب صاف کرو۔ یہ تجارت کا پہلا اصول ہے۔ بلرام سنگھ نے کوئی گناہ نہیں کیا بلکہ اس نے تو اس کمیشن کے پچاس ہزار روپے میں سے بھی تیس ہزار روپے مجھے لاکے دے دیئے۔ ایسا فرمانبردار ہے میرا ہونے والا داماد!"

"ممی اور بیٹی کے لئے ہوگا آپ کا داماد! میں تو اس کو بھرے منڈپ

میں گولی مار دوں گی اگر اس نے مجھے ہات لگایا۔" سندھیا کھانے کی میز سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"یاد رکھو آج سے تم میری حفاظت میں ہو!"

"میرا جسم تو ہے۔ لیکن میرا دل تو نہیں ہے!"

آدھی رات کے قریب سندھیا نے اپنے باپ کے کمرے کو کھٹ کھٹا کر اسے جگایا۔ دھنپت رائے گھبرا کر آنکھیں ملتا ہوا شب خوابی کے کپڑوں ہی میں باہر آگیا۔

"کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"میرے ساتھ باہر آیئے۔" وہ سرگوشی کے لہجہ میں بولی۔

باپ سر جھکا کے سلیپر گھسیٹا ہوا بیٹی کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ چوبی سیڑھیوں پر دبیز غالیچے بچھے ہوئے تھے۔ ورنہ قدموں کی آواز بلند ہوتی۔ ہولے ہولے احتیاط سے سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ ہال کمرے میں داخل ہوئے۔ ہال کے باہر پورچ میں چوکیدار پہرہ دے رہا تھا۔ سندھیا اسے خبردار کرنا مناسب نہیں سمجھتی تھی۔ وہ ہال کا پچھلا دروازہ کھول کر اپنے باپ کو باغ میں لے گئی۔ باغ کی نیم اندھیری روشوں پر چلتے چلتے وہ دونوں باغ کی اس دیوار تک پہونچ گئے جس کے دوسری طرف بلرام سنگھ کے بنگلے کا وسیع باغ تھا۔

یہاں دھنپت رائے نے دیکھا کہ اس کے باغ کی جانب دیوار سے ایک سیڑھی رکھی ہے۔

باپ نے حیرت سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔

سندھیا نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور خود سیڑھی چڑھنے لگی اور باپ کو اپنے بعد آنے کا اشارہ کیا۔ سیڑھی چڑھ کے وہ دیوار کے دوسری طرف کود گئی۔ دھنپت رائے چند لمحہ تو ہچکچایا پھر ہمت کر کے وہ بھی دیوار کے دوسرے طرف سیڑھی چڑھ کے کود گیا۔

اب وہ دونوں درختوں کے تاریک سایوں میں دبکے ہوئے بلرام سنگھ کے بنگلے کے پچھواڑے کی طرف جا رہے تھے۔ چاروں طرف گہرا سناٹا تھا۔ اور دھنپت رائے خود کو ایک چور کی طرح محسوس کر رہا تھا اور اپنی اس حماقت پر پچھتا رہا تھا کہ وہ کیوں بغیر پوچھے اپنی بیٹی کے ساتھ چلا آیا۔ دور بنگلے کے دوسری طرف پورچ میں کہیں پر دو کتے بھونکے اور دھنپت کے سر کے بال کھڑے ہو گئے۔ اندھیرے میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کتے کاٹ سکتے ہیں۔ چوکیدار ڈاکو سمجھ کے گولی چلا سکتا ہے پیشتر اس کے کہ معلوم ہو کہ وہ کون ہے۔ اس کی جان لی جا سکتی ہے۔ عجب مصیبت میں پھنس گیا میں تو۔ اب لوٹ بھی نہیں سکتا کیونکہ سندھیا نے ایک ٹوٹے ہوئے کانچ کے اندر ہات ڈال کر ہال کے پچھواڑے کی چٹخنی کھول لی تھی اور اب دبے پاؤں ہال کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی اور مجبور ہو کر دھنپت رائے کو اس کے پیچھے پیچھے جانا پڑ رہا تھا۔ اب وہ غصے سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ مگر مجبور تھا۔

جہاں پر چوبی سیڑھیاں ختم ہو کر اوپر کی منزل شروع ہوتی تھی اس لینڈنگ کے نیچے بلرام سنگھ کا بیڈ روم تھا۔ جس کا ایک روشندان لینڈنگ کے قریب آتا تھا۔ روشندان کے سیاہ شیشے کے بیچ میں غالباً ابھی ابھی ایک روپے کی گولائی کے برابر وارنش کو کھرچ دیا گیا تھا اس میں روشنی پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھی۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ بیڈ روم میں ابھی تک کوئی جاگ رہا ہے۔

سندھیا اوپر کی لیڈنگ پر پہونچ کر رک گئی۔ اور جب اس کا باپ بھی لیڈنگ پر آ گیا تو وہ لیڈنگ پر اوندھی لیٹ گئی اور نیچے جھک کر بہت آگے جھکتے ہوئے اس نے اپنے باپ سے کہا کہ وہ کہیں پھسل کر نیچے ہال میں نہ جا گرے اس لیے اس نے اپنے باپ سے کہا کہ وہ اس کی ٹانگیں پکڑے رکھے۔ سیٹھ دھنپت نے ایسا ہی کیا۔ کہ اس موقع پر کوئی احتجاج فضول تھا۔ چنانچہ سندھیا اپنا دھڑ سرکا کر بہت نیچے لٹک گئی حتیٰ کہ اس کے دونوں بازوؤں نے روشندان کو دونوں طرف سے پکڑ لیا اور اس ایک روپے والی گولائی کے اندر سندھیا نے اپنی آنکھ جما دی۔ تھوڑی دیر تک دیکھنے کے بعد اور اپنا اطمینان کرنے کے بعد اس نے باپ کو سرکانے کا اشارہ کیا اور اس کا باپ اس کے جسم کو کھینچ کر پھر لیڈنگ پر لے آیا۔ اب سندھیا نے اپنے باپ کو روشندان سے دیکھنے کا اشارہ کیا۔ دھن پت رائے لیڈنگ پر لیٹ گیا۔ اس کی بیٹی نے نہایت مضبوطی سے اس کی ٹانگیں پکڑ لیں۔ مگر دھنپت رائے اپنے قد میں سندھیا سے بہت لمبا تھا۔ اس لیے اسے روشندان تک پہونچنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ کچھ دیر تک وہ روشندان پر آنکھ لگائے اندر دیکھتا رہا۔ پھر بہت دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر جب اس کی سانس زور زور سے چلنے لگی تو اس کی بیٹی نے پیچھے سے اسے ایک جھٹکا دے کر کھینچا اور بڑی بیزاری سے بولی۔

"کیا اب تک جو دیکھا ہے وہ کافی نہیں ہے؟"

سیٹھ دھنپت رائے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ واپس لیڈنگ پر سرک آیا۔ اپنی بیٹی کی مدد لے کر۔ پھر کپڑے جھاڑے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ غصے سے یا نہ جانے کس جذبے سے اس وقت لال ہو رہا تھا۔ بہر حال وہ خود بھی اس وقت اپنے کسی جذبے کا تجربہ نہ کرنا چاہتا تھا۔ جلد سے جلد

وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ پہلے جہاں پر راستے بھر بیٹی نے رہنمائی کی تھی وہاں پر اب باپ راستہ دکھا رہا تھا۔ بلکہ واپس جاتے وقت باپ اس قدر جوش میں بھر چکا تھا کہ دیوار پھاند کر اپنے بنگلے میں جانے کے بجائے وہ بلرام سنگھ کے بنگلے کے سامنے کی روشوں پر ہو لیا۔ اس کی بیٹی اسے منع ہی کرتی رہ گئی۔ مگر دھنپت رائے نہیں مانا۔ چوکیدار ہاتھ میں بندوق لئے ٹھٹھکا مگر پیشتر اس کے کہ وہ نشانہ سیدھا کرے سیٹھ دھنپت نے کڑک کر کہا۔

"یہ میں ہوں سیٹھ دھنپت!"

اور چوکیدار نے گھبرا کر اور سیٹھ کو پہچان کر سیلوٹ مارا اور پھر سامنے کے باغیچے کا آہنی پھاٹک سیٹھ کے گذر جانے کے لئے کھول دیا۔ دونوں باپ بیٹی آہنی پھاٹک میں سے باہر نکل گئے۔

دوسرے دن سیٹھ دھنپت رائے نے ٹھاکر بلرام سنگھ کو اپنے مل کے بڑے آفس میں بلا کر اسے مل کی منیجری سے برطرف کر دیا اور اس کا کل حساب چکتا کر دیا اور اسے ۲ دو دن کے اندر مل منیجر کا بنگلہ خالی کر دینے کا حکم دے دیا۔

پھر اس نے ٹیلیفون اٹھا کر پالن گڈھ کے تھانے میں سب انسپکٹر کو کہا کہ وہ دلیپ کو رہا کر دے "میں اغوا کا الزام واپس لیتا ہوں؟"

ٹیلیفون پر انسپکٹر بولا۔ "مگر مقدمہ تو عدالت میں ہے اور آج سینچر ہے اور کل اتوار ہے۔ اب یہ ریمانڈ تو سوموار کی صبح کو عدالت سے منسوخ ہو سکتا ہے!"

"اس وقت کیوں نہیں ہو سکتا؟" سیٹھ نے پوچھا۔

"کچہری بند ہو چکی ہے۔" سب انسپکٹر نے بتایا۔

"اچھا۔ تو پھر سوموار کو۔۔؟"

"ہاں۔ سوموار کو بالکل پکا ہے سیٹھ جی۔ سب سے پہلے آپ ہی کا کام کروں گا۔ ویسے دلیپ بابو کو یہاں کسی طرح کی تکلیف نہیں ہے۔"

شام ہوتے ہی سندھیا دلیپ سے ملنے کے لئے آگئی۔ بے چارے سب انسپکٹر نے اپنا آفس دونوں چاہنے والوں کے لئے خالی کر دیا اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر قریب کے کسی گاؤں میں گشت کرنے کا بہانہ بنا کے رخصت ہو گیا۔

دلیپ سیٹھ دھنپت رائے کی قلب ماہیت پر حیران ہو رہا تھا۔

"آخر یہ ہوا کیسے۔ تم نے کون سی جادو کی چھڑی گھمائی۔؟"

سندھیا مسکرانے لگی۔ "نہیں بتاتے۔!"

دلیپ اس کے قریب آبیٹھا۔ اب وہ دونوں کھڑکی میں بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے کی پہاڑی پر دھن تال کا بندھ تھا۔ نیچے پالن گڈھ کا گاؤں اور کھیت اور ٹھاکر دل کا فارم۔ اور بائیں طرف دھومی ندی ایک نقرئی فیتے کی طرح زمین کی ہریالی میں جھالریں لٹکاتی ہوئی نظر سے غائب ہوتی جا رہی تھی۔ دھومی ندی جہاں سے نکلتی تھی وہاں پہاڑیوں کا سلسلہ چیڑھ کے جنگلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ جب شام کی ہوا چلتی تھی تو ان دور کے جنگلوں سے ایک عجیب وحشی سی مہک آتی تھی۔ ان پہاڑیوں سے نیچے اتر کے کئی خوبصورت ٹیلے تھے۔ چھوٹے چھوٹے۔ پہاڑی نما خوشنما ٹیلے۔ کھیتوں کے سر کے اوپر ایک اونچی تکون بنائے ہوئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

دلیپ نے سندھیا کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ "ہاں تو پھر کیا ہوا؟"
سندھیا نے کھڑکی سے مڑ کر دلیپ کی جانب دیکھا۔
"لولا میک گی کو جانتے ہو؟"
"وہ سرخ بالوں والی لکھنؤ کی حسینہ؟" دلیپ نے پوچھا۔
"ہاں وہی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" سندھیا بولی۔ "بس اس وقت وہی میرے کام آئی۔ !"
"وہ کیسے؟"
"تمہارے بتانے پر مجھے اتنا تو معلوم ہو چکا تھا کہ بلرام سنگھ سے اس کی دوستی ہے۔ لیکن یہ تو اب کے لکھنؤ جانے پر عقدہ کھلا کہ پتاجی بھی اسے بہت پسند کرتے ہیں۔"
"تمہارے پتاجی؟" بے اختیار دلیپ کے منہ سے نکلا۔
"ہاں بھئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !" سندھیا نے کسی قدر بیزاری سے کہا۔ "آخر کیا کریں، ہ رنڈوے ہیں۔ !"
سندھیا کے لہجہ میں ذرا سی تلخی آ گئی تھی۔ دلیپ کچھ دیر چپ رہا۔ دراصل اسے ٹوکنا نہیں چاہیئے تھا۔ مگر اب کیا کیا جائے۔ بات زبان سے نکل چکی تھی۔

سندھیا نے دلیپ کی خاموشی کا سہارا لے کر خود بخود اپنی تلخی پر قابو پا لیا پھر مسکرا کر طنزیہ لہجہ میں بولی۔
"وہ پتاجی سے ملنے ہوٹل میں آتی تھی اور کبھی کبھی چھپ کر بلرام سنگھ سے بھی مل لیتی تھی اور یہ دونوں باتیں اس لئے ممکن تھیں کہ پتاجی کا کمرہ ہوٹل کی پہلی منزل پر تھا اور بلرام سنگھ کا نچلی منزل پر۔ پتاجی کو اس کی بالکل خبر نہ تھی۔ مجھے

بھی لکھنؤ جا کے پتہ چلا۔ اب کے۔ کہ پتاجی اس طرح کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ دو ایک بار میں نے انہیں لولا کے ساتھ ناچتے دیکھا۔ نگاہوں سے بہت کچھ پتہ چل جاتا ہے ناں؟" سندھیا نے اپنی شریر چمکتی ہوئی نگاہیں دلیپ کے چہرے پر گاڑ دیں۔ "ہے ناں؟۔ میں نے پتاجی کی نگاہیں دیکھ لیں اور لولا کی بھی۔ جب وہ پتاجی کے ساتھ "ناچتے" ناچتے" دور پرے پتاجی کی کرسی کے پیچھے مؤدب کھڑے بلرام سنگھ کو دیکھ لیتی تھی۔ اس سے مجھے بہت کچھ اندازہ ہوگیا۔"

"پھر۔۔۔۔۔؟"

"پھر ——— میرا کچھ ایسا اندازہ تھا کہ اب کے بلرام سنگھ جو لکھنؤ سے آیا تھا تو ممکن ہے لولا کو ساتھ لایا ہو یا لولا خود اس کے بنگلے میں پہلے سے آ کے رہ گئی ہو۔ کیونکہ آج سنیچر ہے اور کل اتوار کی چھٹی ہے اور انہی دنوں میں وہ اکثر بلرام سنگھ کے پاس چھپ کر آیا کرتی ہے۔!"

"ہاں ——— پھر———؟"

"پھر۔ میرا اندازہ صحیح نکلا۔ پہلے تو میں نے خود چھپ کر اسے دیکھنے کے لئے بلرام سنگھ کے بنگلے میں گئی اور میں نے بلرام سنگھ کے بیڈروم کے روشندان سے جھانک کر جب خود لولا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو پھر دوسری بار اسی رات پتاجی کو ساتھ لیجا کے انہیں بھی دکھا دیا۔ لولا اور بلرام سنگھ کو ایک بیڈ روم میں۔۔۔"

"پھر۔۔۔؟"

"پھر کیا؟ ——— میں ایک مرد اور ایک بزنس مین دونوں کی نفسیات کو کچھ تو سمجھتی ہوں۔" سندھیا کا لہجہ پھر تلخ ہونے لگا۔ "ایک مرد دوسرے مرد کو اپنی لڑکی دے سکتا ہے۔ مگر اس کی آغوش میں اپنی

محبوبہ نہیں دے سکتا۔ وہ اسے اپنا داماد بنا سکتا ہے۔ رقیب نہیں بنا سکتا۔ اس سے ایک بزنس مین کی حسِ ملکیت مجروح ہوتی ہے۔ پتا جی نے آج صبح ہی بلرام سنگھ کو ہمیشہ کے لئے چھٹی دے دی ہے اور مجھے تم سے شادی کرنے کی اجازت دے دی ہے۔"

دلیپ زور زور سے ہنسنے لگا۔ "بھئی بے حد سمجھ دار ہوتی جا رہی ہو۔ اپنے سامنے یوں ایک بیٹی کا اپنے باپ کو بے نقاب کرنا مجھے اچھا نہیں لگا۔"

سندھیا یکایک سنجیدہ ہو گئی۔ "وہ بے چارے اب مجھ سے نظریں نہیں ملاتے ہیں۔ ۔ ۔ مگر مجبوری تھی۔ ۔ ۔ ۔ کل کی بات ہے۔ پرسوں تم رہا ہو جاؤ گے۔ ۔ ۔ ۔"

"پھر کوئی پریشانی نہیں رہے گی۔!"

دلیپ اور سندھیا دونوں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔ شام کی سنہری دھوپ سامنے کی پہاڑی نما ٹیلوں کی نکون سے آہستہ آہستہ غائب ہو رہی تھی۔

سندھیا نے بیچ کے بڑے اور اونچے ٹیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"شادی کے بعد میں وہاں اپنا گھر بناؤں گی۔ چھ بیڈروم والا!"

"چھ بیڈروم کا ہے کے لئے؟" دلیپ نے پوچھا۔

"ایک میں ایک تم۔ چار ہمارے بچے۔ کل کتنے ہوئے؟"

دلیپ خوشی سے جھلنے لگا۔

"باہر بہت بڑا برآمدہ بناؤں گی۔ جہاں سے ساری وادی کا نظارہ دکھائی دے گا۔ برامدے کے باہر سے ٹیلے کے قدموں تک ٹیلہ کاٹ کاٹ

کے جاپانی گارڈن بناؤں گی۔ اتنا خوب صورت سا جاپانی گارڈن میرے ذہن میں ہے جو خود جاپان میں کہیں نہ ہوگا۔" وہ گہرے یقین سے بولی۔

"کیونکہ تخیل ہمیشہ حقیقت سے بلند ہوتا ہے۔" دلیپ نے کہا۔

"یہ آمدے کا ایک کونہ عشق پیچاں سے گھرا ہوگا۔ شام کو ہم دونوں۔ صرف ہم دونوں اس کونے میں بیٹھ کر چینی کے پیلے اور منقش پیالوں میں وہ اصلی پھیکے سنہرے رنگ والی چائے پیا کریں گے جس سے جوہی کی مہک آتی ہے۔ سورج تمہارے رخساروں پر غروب ہوگا اور پہاڑوں سے آنے والی وحشی ہوا تمہارے کھلے ہوئے خوبصورت بالوں کو چھیڑ کر بھاگ جایا کرے گی۔۔۔۔۔۔!"

"بھاگے گی کیوں؟" دلیپ نے مسکرا کر بیچ میں پوچھ لیا۔

"ورنہ میں اسے پکڑ کر پیٹوں گی نہیں کہ اس نے کیوں میرے بالوں کو ہاتھ لگایا۔" سندھیا غصے سے کہنے لگی

"ارے تم تو ہوا سے بھی حسد کرنے لگیں۔" دلیپ زور زور سے ہنسنے لگا۔

پھر وہ اکدم سنجیدہ ہوگیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں سندھیا کا چہرہ لے کر اسے بڑے غور اور بڑے پیار سے دیکھا۔ پھر اس چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں کا سہارا دے کر اپنے سینے پہ اتار لیا اور گہرے یقین سے بولا۔

"ہاں وہ گھر ضرور بنے گا۔ صرف ایک دن ہی کی تو بات ہے۔ اب وہ گھر ضرور بنے گا۔!"

سنیچر کی رات کو لولا نے بلرام سنگھ سے پوچھا۔
"اب تم کیا کرو گے؟ زمینداری بھی گئی اور مل کی مینیجری بھی۔ اب تم کہاں جاؤ گے؟"
"صاف صاف کیوں نہیں پوچھتی ہو کہ میرا خرچہ کہاں سے دو گے؟"
"لولا کے بہت عاشق ہیں۔" سرخ بالوں والی یوروپی حسینہ نے اپنی گردن جھٹک کے بڑے غرور سے کہا۔
بلرام سنگھ جو کئی پیگ پی کر دھت ہو چکا تھا اور تقریباً نیم غنودگی میں تھا۔ یکایک چونک کر بگڑ گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر زور سے لولا کی گردن پکڑ لی۔ "ایں؟ کیا کہا؟"
لولا زور سے چیخی۔ "میری گردن چھوڑ دو۔ میں تو مذاق کر رہی تھی۔"
بلرام سنگھ نے گردن چھوڑ دی۔ اور جب ہات نے لولا کی گردن چھوڑ دی تھی اس ہات کے پھیلے ہوئے پنجے کو دیکھ کر کہنے لگا۔ "پھر کبھی ایسی بات مت کہنا۔ بلرام سنگھ کے ہات بڑے مضبوط ہیں۔"
لولا نے جلدی سے اس کے لئے ایک اور پیگ بنایا۔ اپنے ہاتوں سے گھونٹ گھونٹ کر کے اسے پلانے لگی۔ اور اس کے غصے کو اپنے بوسوں سے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ آٹھ دس بوسوں کے بعد جب بلرام سنگھ کی طبیعت بحال ہوئی تو وہ ایک چالاک شرابی تبسم لاکر بولا۔ "بلرام سنگھ سے بچ کر آج تک کوئی نہیں جا سکا۔ . . . میرا دماغ بہت کام کرتا ہے۔

"۔۔۔ بہت کام کرتا ہے۔۔۔۔!"

"کیا کام کرتا ہے؟" لولا نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ہش۔۔۔۔" بلرام سنگھ نے ایک انگلی اپنے ہونٹ پر رکھی۔ "مجھے سوچنے دو۔!"

پھر وہ اسی طرح ایک انگلی اپنے ہونٹ پر رکھے رکھے سو گیا پھر لولا بھی کروٹ بدل کر اس کے قریب سو گئی۔

آدھی رات کے قریب بلرام سنگھ ہولے سے اپنے بستر سے اٹھا اور اس نے اندھیرے ہی میں بیڈ روم کی چٹخنی کھول کر باہر کی بتی روشن کی۔ لولا نیند اور نشے میں سرشار بے خبر سو رہی تھی۔ بلرام سنگھ نے آہٹ کئے بغیر اپنے کپڑے بدلے۔ تکیے کے نیچے سے چابیوں کے دو گچھے نکالے اور باہر کی بتی بجھا کر اور بیڈ روم کو باہر سے تالا لگا کر بنگلے سے باہر نکل گیا۔ گیراج میں جا کر اس نے اسٹیشن ویگن نکالی اور اسے اسٹارٹ کر کے باہر کی تاریک سڑک پر غائب ہو گیا۔

صبح پانچ بجے کے قریب وہ چپکے سے اپنے بیڈ روم میں لوٹ آیا اور بستر پہ پڑ کر سو گیا۔ صبح آٹھ بجے کے قریب جب لولا جاگی تو اس نے بلرام سنگھ کو بدستور بستر پہ سوتا پایا۔ کوئی نو بجے کے قریب اس نے بلرام سنگھ کو جگانے کی کوشش کی۔ مگر اس نے ایک بار آنکھ کھول کے کہا۔ "مجھے سونے دو۔" اور پھر سو گیا۔ پھر وہ قریب گیارہ بجے اٹھا۔ منہ دھو کر اس نے لولا کے ساتھ لنچ کھایا۔ لنچ کے بعد جب لولا نے واپس لکھنؤ جانے کے لئے خواہش ظاہر کی۔

"آج تو اتوار ہے۔!"

"مگر کل تو مجھے کام پر حاضر ہونا ہے!"

"کل کی چھٹی لے لو۔ کل دونوں یہاں سے اکٹھا لکھنؤ چلیں گے۔ کل صبح تک تو مجھے یہ بنگلہ خالی کر دینا ہے۔ اور تمہاری وجہ سے یہ گھر خالی کرنا پڑ رہا ہے۔ ورنہ آج کل میں سیٹھ کا داماد ہوتا۔"

"تم مجھ سے اس قدر پیار کیوں کرتے ہو؟" لولا نے اس سے پوچھا۔

"اوہ ہو ہو ہو۔" بلرام سنگھ تضحیک آمیز لہجہ میں زور زور سے ہنسنے لگا۔ "کون کس سے پیار کرتا ہے؟۔ یہ کیا وہم ہے تمہارا۔۔۔۔۔؟"

لولا کا چہرہ ایکدم اتر گیا۔ غصے سے اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ بلرام سنگھ نے اس کے غصے کو بھانپ کے فوراً اسے اپنی باہوں میں لے لیا اور زور سے جکڑتے ہوئے بولا۔ "میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ بہت پسند کرتا ہوں۔ کیونکہ تم بھی خودغرض ہو۔ میری طرح مکمل خودغرض ہو۔ مجھے ایسے لوگ بہت پسند آتے ہیں۔ جو اپنے سامنے ہر ایک کو ہیچ سمجھیں۔۔۔۔۔ بھیڑیئے کی بیٹی۔ میں تجھے بہت پسند کرتا ہوں۔"

لولا نے اپنے دانتوں سے اس کے بازو کو ہولے سے کاٹ کھایا۔ پھر کلکلانا چھوڑ کر اسی طرح اس کے بازو میں کھڑے کھڑے اس سے پوچھنے لگی۔

"مگر اب کرو گے کیا سوچا بھی ہے؟"

"رات کو بتاؤں گا۔ اس وقت کچھ مت پوچھو۔ رات کو بتاؤں گا۔"

"رات کو؟" لولا نے پوچھا۔

"ہاں اس وقت ایک ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں۔ رات کے دس گیارہ بجے واپس آؤں گا۔ اس عرصے میں تم سب سامان باندھ لینا۔ اور سامان باندھ کے نوکروں اور چوکیدار کو شام ہی سے چھٹی دے دینا۔ یہ لو ان کی تنخواہ کے پیسے۔"

بلرام سنگھ نے اپنی جیب سے کئی نوٹ نکال کے لولا کو دے دیئے۔ رقم

نوکروں کی مجموعی تنخواہ سے بہت زیادہ تھی۔ اس لئے لولا بہت خوش ہوئی۔

"بارہ بجے تیار رہنا۔ سامان باندھ کے۔ چپکے سے رات کو سامان اسٹیشن ویگن میں لاد کے نکل چلیں گے۔"

لولا مسکرائی سا سی لئے وہ نوکروں کو بنگلے سے پہلے ہی رخصت کر دینا چاہتا تھا کہ وہ اس کی شکست خوردگی نہ دیکھ سکیں۔ ہاں ٹھیک تو ہے۔ اس نے اپنے دل ہی دل میں سوچا۔

پھر بلرام سنگھ کے جانے کے بعد وہ نوکروں کو ہدایات دینے میں مصروف ہو گئی۔

سہ پہر سے شام تک سب سامان بندھ گیا۔ آٹھ بجے کے قریب ڈنر بھی تیار ہو گیا تو لولا نے باورچی سے کہا کہ وہ ڈنر کو ہاٹ کیس میں رکھ دے۔ پھر اس نے باورچی کو بھی چھٹی دے دی۔ اور سب ملازموں کو بخششیں دے دی۔ نو بجے کے قریب سارا بنگلہ ملازموں اور چوکیداروں سے خالی ہو گیا۔ باغ بھائیں بھائیں کرنے لگا۔ تاریک جھاڑیوں میں جھینگر بولنے لگے۔ اور ٹہنیوں پر آرام کرتے ہوئے پرندے کبھی کبھی اچانک پر پھڑپھڑانے لگتے تو لولا چونک جاتی اور کانپ جاتی۔ اس نے بنگلے کے سارے دروازے اور کھڑکیاں اور روشندان بند کر دئے اور بیڈ روم کے باہر تالا لگا دیا اور خود کھڑکی سے اندر کو دکر اس نے کھڑکی بھی اندر سے بند کر لی۔ اتنے بڑے بنگلے میں اپنے آپ کو اکیلا پا کر وہ خود بخود ڈری جا رہی تھی رات کو خنکی بڑھ گئی۔ لولا نے برانڈی کا ایک بڑا پیگ بنایا اور اسے حلق میں اتار کر گرم گرم بستر میں نیم دراز ہو گئی اور تکیوں کے سہارے بیٹھ کر ایک جاسوسی ناول پڑھنے لگی۔

رات کے دس بج گئے۔

گیارہ بج گئے۔

بارہ بج گئے۔

مگر بلرام سنگھ نہیں لوٹا۔ لولا کو تشویش ہونے لگی۔ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ کچھ دیر تک تشویش اور بھوک میں جنگ ہوتی رہی۔ آخر بھوک نے فتح پائی۔ پہلے وہ کھانا کھالے پھر وہ تشویش کرتی رہے گی۔ تشویش کے لئے ساری رات پڑی ہے مگر بھوک اب مزید صبر کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اس نے ہاٹ کیس سے کھانا نکال لیا اور دھیرے دھیرے اسے کھانے لگی۔ کھانا کھاتے ہوئے اس نے کہیں پر ایک عجیب سی آواز سنی۔ ایک مدھم سی گونج۔ . . . . . وہ چونکی۔ پھر چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ دیر تک لولا کا لقمہ اس کے ہات میں رہا۔ اس کی گردن کی پشت پر ایک عجب تھرتھری سی محسوس ہوئی۔ جیسے اس کے سر کے بال تن کر کھڑے ہور ہے ہیں۔ مگر پھر بہت دیر تک سناٹا چھایا رہا۔ اور وہ اپنا وہم دور کر کے پھر کھانے میں مشغول ہو گئی اور اس کی گردن کی تھرتھری بھی غائب ہو گئی۔

اچانک قریب سے ایک کھٹکا ہوا۔ جیسے کوئی بھاری قدموں سے ہال کے اندر آرہا ہو۔ لولا نے کھانا وہیں چھوڑ دیا اور جھٹ تکئے کے نیچے سے پستول نکال کے کھڑی ہو گئی۔ بھاری قدم بیڈ روم کے باہر آکر رک گئے۔ لولا نے پستول کو زور سے پکڑ لیا۔

پھر بیڈ روم کے تالے میں چابی ڈالنے کی آواز آئی۔ کھٹکے کے بعد تالا کھلا۔ دروازہ کھلا اور بلرام سنگھ اپنے کندھے پر سندھیا کو لئے ہوئے داخل ہوا۔ جس کے ہات پاؤں بندھے تھے۔

بلرام سنگھ نے سندھیا کو اپنے کندھے سے گرا کر بستر پر پٹخ دیا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر لولا کا پستول چھین لیا۔ " پاگل ہوئی ہو۔ مجھے پہچانتی نہیں ہو ہم"

لولا حیرت سے کبھی بلرام سنگھ کی طرف دیکھتی۔ کبھی بندھی ہوئی سندھیا کی طرف۔

"اسے یہاں کیوں لائے ہو؟" آخر اس نے پوچھ ہی لیا۔

"میرے بازوؤں میں آجاؤ تو بتا دوں گا۔"

لولا نے قدرے توقف کیا۔ پھر اس کے بازوؤں میں چلی گئی۔

لولا کو بازوؤں میں لیتے ہوئے بلرام سنگھ نے اسے مضبوطی سے جکڑ لیا اور اس سختی سے جکڑا کہ درد سے بیتاب ہو کر لولا چلانے لگی۔ "کیا کرتے ہو؟ کیا کرتے ہو؟"

مگر بلرام نے اس کی ایک نہیں سنی۔ اس نے زور دے کر لولا کو بستر پہ گرا دیا اور اس کے ہاتھ پاؤں سندھیا کی طرح باندھ دیئے۔ البتہ اس کا منہ بند نہیں کیا گیا۔

پھر وہ جکڑی ہوئی لولا کی طرف یوں مخاطب ہوا۔ "آج تک بلرام سنگھ نے کسی سے ہار نہیں مانی ہے۔ وہ آج بھی ہار نہیں مانے گا۔ سنو لولا میں نے سیٹھ دھینت رائے کو اپنی گولی کا نشانہ بنا دیا ہے۔ وہ مر چکا ہے اور اب سندھیا میرے ساتھ مرنے جا رہی ہے۔ سنو لولا۔ کان کھول کے سنو۔ کیونکہ اس عجیب و غریب ڈرامے کی چشم دید گواہ تمہیں زندہ رہو گی۔ اس لیے میں تمہیں بتا تا ہوں۔ کہ میں نے دھن تال کے بندھ کی دیوار میں ڈائنامائٹ کی سرنگ بچھا دی ہے۔ سارا پالن گڈھ سو رہا ہے۔ سندھیا کا عاشق حوالات میں ہے اور سیٹھ دھینت اپنے بستر پر مردہ ہے اور اب میں سندھیا کو لے کر دھن تال کی پہاڑی کی چڑھائی چڑھنے جا رہا ہوں۔ چند گھنٹوں کے بعد تم ایک خوفناک گرج سنو گی۔ پھر دھن تال کا بندھ ٹوٹ جائے گا۔ اور لاکھوں ٹن پانی خوفناک تیز رفتاری سے نیچے گرتا ہوا سوئے ہوئے پالن گڈھ۔ اس کے گاؤں۔ کھیت اور اس کھلیانے کو بھی ڈبوتا ہوا جس میں

اس لڑکی کا عاشق قید ہے۔ تمہارے بنگلے کے دروازے تک آجائے گا۔ سب لوگ ڈوب جائیں گے اس میں۔ میں اور سندھیا۔ دلیپ اور گاؤں کے سب لوگ۔ کھاکر اور کسان۔ پالسی اور کولی۔ کھیت اور فصلیں۔ کچھ باقی نہ رہے گا۔ کیونکہ اگر بلرام سنگھ کو یہاں سے چلا جانا ہے تو پھر ہر چیز کو یہاں سے چلا جانا چاہیئے جو اس سے متعلق ہے۔۔۔۔۔۔ سنتی ہو۔۔؟"

"تم ایسا نہیں کرو گے۔" لولا چیخی۔

"میں ضرور ایسا کروں گا۔ ڈیڑھ دن سے میں اور کرتا کیا رہا ہوں؟"

پھر اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں والی سندھیا کو بستر سے اٹھا کر اپنے کندھے پر رکھ لیا۔ سندھیا کی آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے بندھے ہوئے ہاتھ پاؤں سے بیکار کی جدوجہد کرتے کرتے عاجز آکر تھک چکی تھی۔ سندھیا کو اپنے کندھے پر رکھ کر وہ ذرا سا جھکا۔ مسکرا کر اس نے لولا کے سنہرے بالوں والے سر کو بڑے پیار سے تھپتھپایا اور بولا۔

"مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر پانی تمہارے یہاں تک آجائے!"

بلرام سنگھ نے اس کے سر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "تم ڈوب جاؤ گی تو پھر ہم دوسرے کنارے ملیں گے۔"

"گڈ بائی۔!"

وہ ایکدم مڑا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ تاریکی میں کچھ دور تک اس کے بھاری قدموں کی آواز آتی رہی۔ پھر خاموشی میں کھو گئی۔ یکایک رات کی تاریکی گہری ہوگئی۔ اور لولا کا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ اس نے اپنے کمرے کے چاروں طرف دیکھا۔ زور زور سے چیخی۔ مگر جب کہیں سے کوئی مدد نہیں آئی تو رات کے بڑھتے ہوئے سناٹے سے دہشت کھا کر خود بخود چپ ہوگئی۔ چند منٹ کے

سکوت کے بعد اس نے زور لگا کر کروٹ لی تو بلرام سنگھ کا بستر سامنے نظر آیا۔ دونوں بستر قریب قریب ساتھ لگے تھے بیچ میں صرف ایک چھوٹی سی تپائی تھی۔ جس پہ ایک ٹائم پیس پڑا تھا۔ ایک ننگی تصویروں والا رسالہ۔ جس کے اوپر شیو کا سامان رکھا تھا۔ برش۔ صابن۔ کانچ کا بول۔ ایک ننگا بلیڈ۔

کچھ دیر تک خاموشی سے ٹکٹکی لگائے لولا اس بلیڈ کو دیکھتی رہی۔ پھر چونک کر اٹھ بیٹھی۔ ہات بڑھا کر اس نے بلیڈ کو اٹھانے کی کوشش کی۔ مگر ہات تو بندھے ہوئے تھے۔ مایوس ہو کر پھر لیٹ گئی۔ دیر تک افسردہ چپ چاپ لیٹی رہی۔ پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا۔ اور اس خیال کے آتے ہی اس نے بستر پر ایک اور کروٹ لی اور اب وہ کروٹ لے کر بلیڈ کے بالکل قریب پہونچ گئی۔ گھسٹتے گھسٹتے آگے بڑھتے بڑھتے اس نے جھک کر اپنے ہونٹوں کی مدد سے بلیڈ کو اٹھانا چاہا۔ مگر بلیڈ ابھی دور تھا۔ وہ پھر جدّ و جہد کر کے چند انچ اور نیچے سرکی۔ دو ایک بار کوشش کرنے سے اس کے ہونٹ بلیڈ کی تیز دھار سے چھل گئے۔ بلیڈ ہونٹوں پر آ کر واپس ہو گیا۔ پھر تپائی سے نیچے زمین پر گر پڑا۔ لولا نے اپنے آپ کو بستر سے نیچے گرا دیا۔ اسے بہت چوٹ لگی۔ مگر وہ زمین پر گھسٹتے گھسٹتے آگے بڑھتی گئی۔ آخر اس نے بلیڈ اپنے ہونٹوں سے اٹھا کر اپنے دانتوں میں لے لیا اور اس کی مدد سے اپنے دونوں بندھے ہوئے ہات اپنے منہ کے قریب لا کر وہ رسّی کو بلیڈ سے کاٹنے لگی۔

اتوار کے دن دلیپ نے دن بھر سندھیا کا انتظار کیا۔ سندھیا نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ معلوم نہیں کیوں نہیں آئی۔ پھر کوئی بات ہو گئی؟ مگر کیا؟ طرح طرح

کے وسوسوں سے دلیپ کا دل گھبرے میں آجاتا تھا۔ جوں جوں وقت گذرتا جاتا تھا دلیپ اداس ہوتا جاتا تھا۔ اس کی اداسی کو دیکھ کر سب انسپکٹر پولیس نے اسے ڈھارس دینے کی کوشش کی۔ بس اتوار کی رات درمیان میں ہے۔ کل صبح تمہیں کورٹ سے آزاد کرا دیا جائے گا۔ افسوس کہ معاملہ عدالت میں ہے۔ ورنہ میں تمہیں آج ہی رہا کر دیتا۔ مگر کیا کروں۔ قانون سے مجبور ہوں۔ جب دس بجے تک سندھیا نہیں آئی تو پولیس انسپکٹر نے تھانے کا چارج حوالدار کے سپرد کیا۔ تھانے کی بندوق اس کے حوالے کی اور خود اپنے گھر چلا گیا۔ اور دلیپ سے صبح بہت جلد آنے کا وعدہ کر گیا۔

مگر دلیپ کی آنکھوں میں نیند کہاں تھی۔ رات کے دس بج گئے۔ گیارہ بج گئے۔ بارہ بج گئے۔ ایک بج گیا۔ دو بج گئے۔ کوئی ڈھائی پونے تین بجے کے قریب جب وہ حوالات کے اندر بیٹھے بیٹھے اونگھنے سا لگا تو کوئی آ کے حوالات کے دروازے کو زور زور سے کھٹکھٹانے لگا۔ دلیپ اونگھتا اونگھتا جاگ گیا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ لولا تھی۔ اسے بڑی مایوسی ہوئی۔ کیونکہ وہ سندھیا کا انتظار کر رہا تھا۔

لولا نے دو تین بار حوالات کی سلاخیں زور زور سے بجائیں۔ بولی۔ "اٹھو اٹھو بلرام سنگھ نے سیٹھ دھنپت کو قتل کر دیا ہے۔ دھن تال پر ڈائنامیٹ کی سرنگیں بچھا دی ہیں۔ اور اب وہ سندھیا کو اپنے کندھے پہ لاد کر دھن تال کو اڑانے جا رہا ہے۔!"

دلیپ چوکنا ہو کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے بندوق لے کر ٹہلتے ہوئے سپاہی سے کہا۔ "مجھے آزاد کر دو!"

سپاہی بولا۔ "حکم نہیں ہے!"

دلیپ بولا۔ "جاؤ فوراً حوالدار کو جا کے بولو۔"

جب سپاہی چلا گیا تو سب سے پہلا سوال جو دلیپ نے لولا سے کیا وہ یہ تھا
"بلرام پیدل گیا ہے یا موٹر پر؟"
"میں نے موٹر کی آواز نہیں سنی!" لولا سوچ سوچ کر بولی۔
دلیپ نے سوچ سوچ کر کہا۔ "ممکن ہے پیدل گیا ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ممکن ہے اس نے اپنی اسٹیشن ویگن کی بیٹری ڈائنامیٹ کی سرنگوں کا تال میل کرنے میں استعمال کی ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تب تو وقت ہے۔ اگر یہ مجھے آزاد کردیں!"
سپاہی واپس آکر بولا۔ "حوالدار تھانے دار کے گھر پر پوچھنے کے لیے گیا ہے۔"
دلیپ غصّے سے چلا کر بولا۔ "ارے تب تک تو اس علاقے میں کوئی زندہ نہیں بچے گا۔ احمق کی دُم۔ مجھے فوراً آزاد کر دے!"
سپاہی نے بڑی مایوسی سے سر ہلا کے کہا۔ "حکم نہیں ہے!"
دلیپ اور لولا بڑی مایوسی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ چند منٹ تک سپاہی کو باری باری دونوں سمجھاتے رہے۔ جب اس پر کوئی اثر نہ ہوا تو دلیپ نے لولا سے کہا۔ "تم پیدل آئی ہو یا موٹر پر؟"
"سیٹھ کی جیپ لائی ہوں!"
"تو جلدی سے جا کے گاؤں والوں کو خبردار کردو اور پھر واپس تھانے کو آؤ۔ جب تک ممکن ہے حوالدار تھانے دار کو لے کر آجائے!"
"ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔"
"میں جانتا ہوں۔ مگر کیا کروں، مجبور ہوں۔ بلرام مجھ سے ایک گھنٹہ کا اسٹارٹ لے چکا ہے۔ بھگوان کرے وہ پیدل گیا ہو۔۔!"
"میں بھی یہی دعا کرتی ہوں۔" لولا اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کے چلائی اور دوڑی ہوئی باہر جا کے جیپ اسٹارٹ کرکے گاؤں والوں کو خبردار کرنے

کے لئے روانہ ہو گئی۔

جب لولا چلی گئی تو اس کے جانے کے چند منٹ کے بعد دلیپ نے بندوق والے پہرے دار سپاہی سے کہا۔ "پیشاب لگا ہے!"

پہرے دار نے حوالات کا دروازہ کھولا۔ اندر آ کے دلیپ کو ہتھکڑی لگائی ہتھکڑی لگا کے دروازہ کھولا۔ دروازہ بند کیا۔ پھر دلیپ کو تھانے کے باہر لے گیا۔ دونوں تاریکی میں گم ہو گئے۔

تھانے کے پچھواڑے چند جھاڑیوں کے قریب جا کر دلیپ کھڑا ہو گیا۔ اور پیشاب کرنے لگا۔ سپاہی پیٹھ موڑ کر کھڑا ہو گیا اور انتظار کرنے لگا ـــــــ یکایک دلیپ بجلی کی سی تیزی سے پلٹا۔ اس نے زور کی ایک لات سپاہی کے دھڑ میں جمائی۔ سپاہی کی بندوق اس کے ہاتھ سے گر گئی اور وہ کئی قدم زمین پر لڑھکتا ہو چلا گیا۔ دلیپ نے فوراً بڑھ کے اپنے دونوں بندھے ہوئے ہاتھوں کے بیچ میں بندوق اٹھا لی اور تیزی سے تاریکی میں غائب ہو گیا۔

وہ تیزی سے دھن تال کی جانب بڑھتا جا رہا تھا۔ اتنی تیزی سے وہ زندگی بھر کبھی نہیں دوڑا تھا اور دوڑا تھا تو صرف کالج کی ریس میں حصہ لینے کے لئے۔ مگر اس قدر تندہی سے وہ وہاں بھی نہ دوڑا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا سارا جسم دو پیروں میں سمٹ کر آ گیا ہے۔ اور وہ دو پیر بڑی تیزی سے دھن تال کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں۔ وہ کھیت۔ راستے۔ کھائیاں۔ چٹانیں۔ ٹیلے سب کچھ پار کر کے بڑی تیزی سے بھاگا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے سانس کی تیز تیز آمد و رفت سے اس کے پھیپھڑے پھٹ جائیں گے مگر اس نے کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی رفتار کو سست نہیں کیا اور تیزی سے برابر بھاگتا رہا۔

آدھے گھنٹے کی سرپٹ تیز رفتاری کے بعد اسے اپنے پیچھے کسی ہارن کی آواز سنائی دی۔ گاڑی کی گڑگڑاہٹ اور جیپ کی دو جلتی ہوئی آنکھیں جنہوں نے دلیپ کو دوڑتے دیکھ کر اسے اپنی روشنی میں لے لیا تھا۔ پھر جیپ کی رفتار تیز ہو گئی اور جیپ اس کے قریب آ کر رک گئی۔ جیپ میں لولا تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ گاؤں کو خبر کر کے آ رہی ہے۔ "تھانے سے مجھے معلوم ہوا کہ تم فرار ہو چکے ہو۔ اس لئے میں سیدھی جیپ بھگا کے یہاں آئی ہوں۔"

"بہت اچھا کیا تم نے!" دلیپ نے جیپ کے اندر کودتے ہوئے کہا "گاڑی چلاؤ۔ ایک منٹ کے لئے بھی نہ رکو۔ وقت نہیں ہے۔ شاید وقت ختم بھی ہو چکا ہے۔"

لولا بڑی تیز رفتاری سے اوبڑکھابڑ راستوں سے جیپ کو چلاتی ہوئی دھن تال کی پہاڑی پر لے جانے لگی۔ جب راستہ ختم ہو گیا تب بھی وہ کافی دور تک اسے لے جاتی رہی۔ جیپ کی آواز اور اس کی روشنیوں نے غالباً بلرام سنگھ کو خبردار کر دیا۔ وہ ایک اونچی چٹان پر کھڑا زور زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے نظر آیا۔ پھر کود کر چٹان کے دوسری طرف چلا گیا۔ چند ثانیے خاموشی میں گذرے پھر ایکدم زور کی چمک اور کڑک ہوئی اور ایک خوفناک گرجدار آواز کیساتھ تیز روشنی کے جھپاکے میں ہزاروں ٹن مٹی اور چٹانیں فوارے کی طرح ہوا میں بکھر کر اڑتی نظر آئیں پھر ایکدم اندھیرا چھا گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

چند لمحہ لولا کی آنکھیں بند رہیں۔ آنکھیں بند کئے وہ طوفان کی طرح پھٹ کر گرنے والے پانی کی آواز سننے کی توقع کرتی رہی۔ مگر جب کئی ثانیے گذر گئے اور کوئی آواز نہ آئی تو اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور بولی۔

"معلوم ہوتا ہے سرنگ کمزور تھی۔ بندھ کی دیوار نہیں ٹوٹی!"

دلیپ بولا۔ "نہیں۔ یہ سرنگ تو ہمارے آگے نہیں ہمارے پیچھے پھٹی ہے دھن تال پہاڑی کے دامن کا راستہ اور پُل اڑا دیئے گئے ہیں تا کہ کوئی بلرام سنگھ کا تعاقب نہ کر سکے!"

دھماکے سے جیپ لڑھک کر دو چٹانوں کے بیچ آ چکی تھی۔ لولا نے بہت کوشش کی کہ جیپ کو نکال لے۔ مگر وہ کامیاب نہ ہوئی۔ اسی عرصے میں کئی بار ہتھکڑی کے مشترکہ آہنی ڈنڈے کو دلیپ نے جیپ کے آہن پر مار مار کر توڑنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا۔

دلیپ پھر جیپ کے باہر کود گیا۔ دور نیچے پہاڑی کے دامن میں اسے گاؤں والے مشعلیں لئے بھاگتے چلاتے اور خوفزدہ ہو کر ایک دوسرے سے باتیں کرتے نظر آرہے تھے۔ بہت سی عورتیں روتی ہوئی اپنے بچوں کو سنبھالتی ہوئی دھن تال کی چوٹی کی طرف خوفزدہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ سائے، روشنیاں جھلکیاں۔ خوف۔ ڈر۔ موت ہر شے گڈمڈ ہو رہی تھی۔

دلیپ نے لولا اور بندوق کو وہیں پیچھے چھوڑ دیا اور خود چٹانوں سے اوپر بھاگا۔ اس دھن تال کا ہر راستہ اس کا دیکھا بھالا تھا۔ بچپن سے اب تک وہ اس پہاڑی کے ہر رگ و ریشے سے آگاہ تھا۔ وہ اس کے سب شارٹ کٹ جانتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر وہ مکمل تیز رفتاری سے چلا اور اس کے شارٹ کٹ استعمال کرتا رہا تو ممکن ہے وہ بلرام سنگھ کو راستے ہی میں پکڑ لے۔ کاش اس کی ہتھکڑیاں نہ لگی ہوتیں ______ کوئی ناممکن کام نہ تھا۔ جب بلرام سنگھ نے قہقہہ لگایا تھا تو اس نے آواز کی سیدھ سے اس کا فاصلہ بھی دریافت کر لیا تھا۔ اگر وہ ہمت کرے تو بلرام سنگھ کو پکڑ سکتا ہے۔ سندھیا کو بچا سکتا ہے۔ بلرام سنگھ اس سے بہت دور نہیں ہے اب!

بلرام سنگھ تھک چکا تھا۔ پھر بھی سندھیا کو اپنے کندھے پر اٹھا کر چلنے پہ مجبور تھا۔ اس دنیا میں ہر شخص کو اپنے انتقام کا بوجھ بھی خود ہی ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ رات کا تیسرا پہر ختم ہو رہا تھا۔ اور صبح کاذب کی ہلکی سی ضو میں چیزیں دھندلی دھندلی دکھائی دینے لگی تھیں۔ اس نے نگاہ اٹھا کے آگے دیکھا۔ اب وہ دھن تال بندھ کی دیوار سے صرف آدھے میل کی دوری پر تھا۔ اتنی دور سے وہ درختوں کا جھنڈ دیکھ سکتا تھا۔ جس کے نیچے اس نے اپنے اسٹینن وگن کی بیٹری زمین گاڑ کے رکھی تھی۔ جس کے سروں سے دور دیہ تار بندھ کی دیوار سے لگے ہوئے ڈائنامیٹ کی سرنگوں تک جاتے تھے۔ بس وہ اگر کسی طرح سندھیا کو لے کر اس جھنڈ تک پہونچ جائے تو سب ٹھیک ہے۔!

اب تک سب ٹھیک ہی ہوا تھا۔ اس نے سیٹھ دھن پت رائے کو سب کچھ بتا کر جان سے مارا تھا۔ بے خبری میں نہیں مارا تھا۔ صرف اس وقت مارا تھا۔ سیٹھ دھن پت کی آنکھوں میں اپنی جان بچانے کے لئے گہری التجا نظر آتی تھی۔ اس التجا کے جواب میں اس نے سیٹھ کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا تھا اور گولی بھی خاموشی سے چلی تھی۔ کیونکہ اس کے پستول کے آگے سائلینسر SILENCER لگا ہوا تھا۔ کچ کی آواز کے ساتھ سیٹھ ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کے آگے گرا تھا اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا تھا۔ اور اس کے کندھے

پر ٹکی ہوئی ہات پاؤں سے بندھی ہوئی سندھیا نے یہ سارا تماشہ دیکھا تھا۔ اور اس وقت سے خاموش تھی۔ پورے راستے وہ اسے اپنے کندھے پر اٹھائے لایا تھا اور پورے راستے وہ خاموش رہی تھی۔ بلرام سنگھ نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس کی کسی بات کا جواب سندھیا نے نہیں دیا تھا۔ جیسے مرنے سے پہلے ہی اس نے اپنے آپ کو اس دنیا سے اٹھا لیا تھا اور اب جیسے وہ اس کی بات کا جواب اپنی موت کی خاموشی کے سوائے نہیں دے سکتی تھی۔

اب تک سب ٹھیک ہوا تھا۔ اس یوروپی گڑیا لولا کے ساتھ بھی اس نے وہی سلوک کیا تھا جس کی وہ حقدار تھی۔ پہاڑی کے دامن میں سرنگیں بچھا کر کیسی دانشمندی سے کام لیا تھا۔ ان سرنگوں نے جیپ کا راستہ توڑ دیا تھا۔ پُل توڑ دیئے تھے اور جا بجا گہری کھائیاں ڈال دی تھیں۔ اب وہ اس کے قریب تک نہیں پھٹک سکتے تھے۔ اور وہ ان کی موت کے دروازے تک پہونچ رہا تھا۔ یہ لوگ جواب اس پیالہ نما وادی کو چھوڑ کر کہیں نہیں بھاگ سکتے۔ ایک دفعہ وہ درختوں کے جھنڈ کے پاس پہونچ جائے پھر وہ سرنگ کے دونوں تار اپنی بیٹری سے جوڑ دے گا اور بس۔ پھر سب ختم ہے۔ دھن تال کا بندھ اور پالن گڈھ کا گاؤں اور کھیت اور ٹھاکروں کا فارم اور مل۔ سب ختم ہو جائے گا! ــــــ پانی کا ریلا اپنے طوفان خروش سے سب کے سر سے گذر جائے گا! ــــــ بس۔ پھر سب ختم ہے!

اس نے اپنی ایک نگاہ سے اگلی موڑ تک پہونچنے کے لئے راستے کا جائزہ لیا کندھے پر اپنے بوجھ کو ٹھیک کیا اور قدم جما جما کر آگے بڑھنے لگا۔ موڑ تک پہونچتے پہونچتے اس کا دم پھولنے لگا۔ مگر اب سستانے کا وقت نہ تھا۔ کیونکہ

لولا اور دلیپ کہیں پر نیچے موجود تھے۔ ان کی جیپ بے کار ہو گئی تھی۔ اتنا تو اس نے بھی ایک پل کی روشنی میں دیکھا تھا۔ مگر وہ دونوں اسی پہاڑی پر نیچے کہیں اس کے تعاقب میں لگے ہوئے آرہے تھے۔ اس لئے رکنا مناسب نہیں ہے۔ اس لئے وہ موڑ کاٹ کے آگے گھوم گیا۔ مگر موڑ کاٹتے ہی وہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔

اس کے سامنے دلیپ کھڑا تھا۔ اس کے دونوں بازو پیچھے تھے اور وہ سینہ تانے اس کے سامنے کھڑا تھا۔

ایک لمحہ کے لئے بلرام بے حد حیران ہوا۔ پھر اس نے دھیرے سے سندھیا کو اپنے کندھے سے ہٹا کر نیچے ایک چٹان پر رکھ دیا اور اس دوران میں اس نے اپنی نظریں ایک لمحہ کے لئے بھی دلیپ سے نہیں ہٹائیں۔ سندھیا کو نیچے چھوڑ کر بلرام سیدھا ہوا اور دھیرے دھیرے دلیپ سے لڑنے کے لئے آگے بڑھنے لگا۔

دلیپ اپنے دونوں بازو پیچھے کی طرف سمیٹے چپ چاپ کھڑا تھا جتی کہ بلرام بالکل اس کے قریب آگیا۔

پھر یکایک دلیپ بیٹھ گیا۔ بڑی تیزی سے اس نے اپنے دونوں کندھے بلرام کی ٹانگوں میں ڈال کر انہیں ہوا میں اچھال دیا۔ بلرام ہوا میں پٹخنی کھاتا ہوا زمین پر گرا۔ اور زمین پر گرتے ہی اس نے بڑی چالاکی سے تین چار زائد پٹخنیاں کھائیں اور بڑی تیزی سے دلیپ کی دست برد سے باہر ہو گیا۔ کیونکہ زمین پر جہاں دلیپ اسے مارنے کے لئے گرا تھا وہاں پر بلرام موجود نہ تھا بلکہ پٹخنیاں کھا کر آگے جا چکا تھا۔

بلرام کے اٹھنے سے دو تین لمحہ قبل دلیپ اٹھ چکا تھا اور بلرام یہ دیکھ کر

حیران ہوا کہ دلیپ کے بازو پھر اس کی پیٹھ کے پیچھے ہیں۔ حالانکہ لڑائی میں یہ دو تین لمحے بہت ہوتے ہیں۔ اس عرصے میں دلیپ ایک چٹان اٹھا کر اس کے سر میں مار کر اس کا خاتمہ کر سکتا تھا۔ مگر دلیپ نے ایسا کیوں نہیں کیا؟

بلرام یہی سوچتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ دلیپ کو بغلی گھونسہ مار کر اپنے قابو میں لینے کی سوچ رہا تھا کہ دلیپ یکایک پورا گھوم گیا اور بلرام کا وار خالی دے کر اس نے اپنے دونوں ہات۔ ہتھکڑی سے جڑے ہوئے ہات اوپر بلند کئے اور چشم زدن میں وہ انہیں پوری طاقت سے بلرام کے چہرے پر اس طرح لایا کہ اپنا چہرہ بچاتے بچاتے بلرام کا آدھا چہرہ کھل گیا اور خون اس کے پھیلے ہوئے گالوں سے جاری ہو گیا۔ اور اسی وقت اسی ثانیئے بلرام نے دیکھا کہ دلیپ کے دونوں ہات ہتھکڑی سے جکڑے ہوئے ہیں اور اسی ثانیئے اس نے اپنی جیب سے پستول نکال کے فائر کیا۔ گولی دلیپ کی ٹانگ میں لگی اور وہ وہیں زمین پر لوٹ کر کراہنے لگا۔

بلرام نے اس کے کراہنے کا لاتوں۔ گھونسوں۔ مکوں سے استقبال کیا۔ پستول واپس اپنی جیب میں رکھتے ہوئے اس نے دلیپ سے کہا۔ "میں دوسری گولی تیرے دل میں اتار سکتا ہوں۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ تو زندہ رہے اور اپنی بہتی گرجتی ہوئی موت کا حادثہ خود اپنی آنکھ سے دیکھے۔!"

بلرام سنگھ نے اس کی پیٹھ میں زور کی ایک ٹھوکر ماری اور سندھیا کو لے کر آگے چلا گیا۔

اگلے چند منٹوں تک وہ بے ہوش تو نہیں ہوا۔ لیکن نیم بے ہوشی کی اسی کیفیت میں ڈوبا رہا۔ جب نگاہوں میں ساری کائنات جھولتی ہے۔ آنکھوں کی پتلیوں پر شفاف سرمئی پردے سے گھومنے لگتے ہیں اور زندگی کے سارے

جنجال اور اس کے سارے فیصلے مِٹ جاتے ہیں۔ چند منٹ تک وہ اسی قسم کی سی کیفیت میں گرفتار رہا۔ جب جاگا تو لولا اس کے سامنے موجود تھی اور اس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔

اب آسمان پر بھور ہو رہی تھی اور دھن تال کا پانی چمکنے لگا تھا۔ مشرقی افق سے آنے والی ہوا کی سحر خیزی دلیپ کے حواس کو مجتمع کرنے میں مدد دے رہی تھی۔ جب وہ جاگا تو اس نے اپنے آپ کو ایک چٹان کے نیچے لیٹا ہوا پایا۔ اس نے سر اٹھا کر لولا کی طرف دیکھا اور اس سے کہا۔

"مجھے سہارا دے کر اور گھسیٹ کر اس چٹان پر لے آؤ۔ جہاں سے میں دھن تال کا بندھ دیکھ سکوں۔"

حالانکہ اس کی ٹانگ میں شدید درد تھا اور اس کی ٹانگ سے بہت سا خون بھی جا چکا تھا۔ پھر اس نے ہمت کر کے اپنے دانت پیس لئے اور کراہنے کی ایک ہلکی سی آواز بھی اس نے اپنے منہ سے نہیں نکالی۔

لولا اسے گھسیٹ کر آدھی چٹان تک لے آئی۔ چٹان پر لیٹا لیٹا اپنے دونوں بازو آگے رکھے وہ چند ثانیوں کے لئے آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔ پھر جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اسے اپنے سامنے دھن تال بندھ کی دیوار نظر آئی۔ کوئی ۲ دو سو گز کے فاصلے پر۔۔۔۔۔۔

پھر اس نے اپنے سے ایک سو گز کے فاصلے پر بلرام سنگھ کو دیکھا جو بڑی ہوشیاری سے سندھیا کو اپنی پیٹھ پر لادے چڑھائی چڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی گردن نیچی تھی اور اس نے اس ہوشیاری سے سندھیا کو اپنی پیٹھ پر لاد رکھا تھا کہ اگر کوئی پیچھے سے اسے گولی مارے تو سب سے پہلے وہ گولی سندھیا کو لگے گی۔ پھر بلرام سنگھ کو۔۔!

دلیپ نے لولا سے کہا۔ "رائفل مجھے دے دو۔!"

لولا نے چند لمحوں کے لئے توقف کیا۔ پھر اس نے رائفل دلیپ کے منہ کے سامنے چٹان پر لٹا دی۔ دلیپ اپنے دونوں جکڑے ہوئے ہاتھوں کی مدد سے رائفل کی شِست سیدھی کرتا رہا۔ چڑھائی چڑھ کر بلرام سنگھ اب ایک اتار کے گھیرے میں گم ہو گیا تھا۔ دلیپ نے اپنے جسم کے ذرے ذرے کو بڑی تیزی سے دبا دیا اور ایک تربیت یافتہ نگاہ سے اس دوسری چڑھائی کے خالی راستے کو دیکھنے لگا جس پر اتار کا گھیرا طے کر کے بلرام سنگھ کو آنا پڑے گا۔

وہ بہترین موقعہ ہو گا۔ اس نے ایک بار شِست کو ٹھیک کیا اور دونوں جکڑے ہوئے ہات لبلبی پر رکھ دیئے۔

اب کیا کرو گے دلیپ؟ گولی مارو گے تو بلرام سنگھ کے ساتھ سندھیا مر جائے گی اور اگر نہیں مارو گے تو سارا گاؤں مر جائے گا۔ سینکڑوں مرد اور عورتیں۔ اور ان کے بچے بالے اور دھان اور گندم اور کھیت اور گھر اور گنے اور مِل اور محبت تمہاری کدھر جائے گی۔ دلیپ کیا اپنے ہات سے اپنی محبوبہ کو ہلاک کرو گے؟ اور اسے ہلاک نہیں کرو گے تو کیا ڈائنامیٹ سے بندھ کے ٹوٹنے کا تماشہ دیکھو گے؟ تو کیا ایک جان کے بدلے سینکڑوں کی جان لو گے؟ تو کیا ان ہاتوں سے جن سے تم اس کے رخسار چھوتے تھے اس پر گولی چلاؤ گے؟ وہ بے بس اور مجبور لڑکی اپنی بڑی بڑی کھلی کھلی آنکھوں سے کیسے تمہاری طرف دیکھ رہی تھی۔ کیا تم ان آنکھوں سے پیار نہیں کرتے؟ کیا تمہارے گالوں کو اس کے بالوں کی خوشبو یاد نہیں ہے؟ کیا تمہارے سینے پر اس کے بوسوں کا سایہ نہیں ہے؟

اس کے دل کے اندر بہت سے دلیپ لڑ رہے تھے "ارے چپ کرو۔ ارے چپ کرو۔" اس نے ان سب سے چپ ہو جانے کو کہا۔ بڑی مضبوطی سے اس نے

رائفل کے کندے کو اپنے شانے سے لگایا اور چٹان پہ لیٹا ہوا رائفل پہ اسقدر جھک گیا کہ اب رائفل اس کے جسم اور جذبے کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی۔!

یکایک انار کے گھیرے سے نکل کر بلرام سنگھ سامنے کی چڑھائی پہ نظر آیا۔ چڑھائی چڑھتے ہوئے وہ تقریباً دوہرا ہو رہا تھا۔ سندھیا اسکی پوری پیٹھ پر حاوی معلوم ہوتی تھی۔ چند لمحوں تک دلیپ سوچتا رہا۔ بلرام سنگھ سامنے اوپر بڑھ رہا تھا۔ بڑھ رہا تھا۔ چند منٹ کے بعد وہ اوپر درختوں کے جھنڈ میں پہونچ جائے گا۔۔

۔۔۔۔۔۔۔ پھر؟

للا کو ایسے محسوس ہوا جیسے دلیپ رائفل پر لیٹا لیٹا سو گیا ہے۔
یکایک دلیپ نے آہستہ سے کہا۔ ”خدا حافظ!“
اور لبلبی دبادی۔

وہ لوگ اسکی لاش کو اسکے سامنے لائے اور انہوں نے سندھیا کو اسکی گود میں ڈالدیا۔ وہ سب لوگ اسکے شکر گذار تھے۔ دھن تال بچ گیا تھا اور گاؤں بچ گیا تھا اور مِل بچ گئی تھی اور کھیت بچ گئے تھے اور فصلیں بچ گئی تھیں۔ کتنا کچھ دلیپ کی ایک گولی نے بچا لیا تھا۔ ان لوگوں نے سندھیا کی لاش کو اسکی جھولی میں ڈالدیا جیسے غیر لوگ کسی بھکاری کی جھولی میں بھیک ڈالدیتے ہیں تو بھی دلیپ کسی کا شکر گذار نہیں ہوا۔ اور اس کی آنکھ سے ایک آنسو نہیں نکلا۔

وہ لوگ اسے چھوڑ کر بہت دور مؤدب کھڑے ہو گئے۔ مگر دلیپ نے نہ انکی طرف دیکھا نہ لاش کیطرف اسکی نگاہیں ان تین اونچے ٹیلوں کی تکون کو دیکھتی رہیں جہاں کبھی سندھیا نے اس کے لئے گھر بنانے کا وعدہ کیا تھا اور وہ ٹکٹکی لگائے اس تکون کو دیکھتا رہا اور دھیرے دھیرے سندھیا کے بالوں میں ہاتھ پھیرتا رہا۔ اور دھیرے دھیرے اس کے

ہاتوں نے سندھیا کے ماتھے کو چھوا۔ اسکے گالوں کو چھوا۔ اسکی آنکھوں کی ٹھنڈی پتلیوں کو چھوا۔ اسکے ناک کے نتھنوں کو چھوا۔ اسکے ہونٹوں کو چھوا۔ دھیرے دھیرے ایسی گہری قربت اور شناسائی سے کہ دور سے دیکھنے والوں کی چیخیں نکل گئیں۔ مگر دلیپ کچھ نہیں بولا اور ایک آنسو بھی اسکی آنکھ سے نہیں گرا۔ اور ہولے ہولے اسکے ہاتھ سندھیا کے چہرے کو یوں ٹٹولتے رہے جیسے یہ بات زندگی اور موت سے آگے بھی کچھ ڈھونڈھتے ہیں۔۔۔۔!

اور اسنے سوچا "میرے بازو ٹوٹ گئے کیونکہ میں نے آسمانوں کو چاہا۔ پھر بھی میں اپنی آنکھوں کے سہارے اڑتا رہا۔ کیونکہ میری آنکھوں میں کسی بیوفا قسمت کا گلہ نہ تھا۔ بس ایک نادیدہ سورج کی یاد ہے!"

اس نے اتنا اپنے دل سے کہا اور لاش پر یوں جھک گیا جیسے دوسری گولی چلانے جا رہا ہو۔

جب چتا جلی۔ وہ اسوقت وہاں موجود نہ تھا مگر چتا کے شعلے اسکی آنکھوں میں موجود تھے اور وہ اس اونچے ٹیلے پر بیٹھا ہوا سندھیا کا گھر بنا رہا تھا۔ چشم زدن میں اسنے سارا گھر بنا ڈالا۔ گلابی ٹائیلوں والا چھ بیڈروم کا گھر جسکے چوبی برآمدے میں عشق پیچاں کی بیلیں لہراتی تھیں اور ڈرائنگ روم کی کھڑکیوں میں مدھم سنہرے پردے جھم جھماتے تھے اور سندھیا جاپانی کیمونو پہنے ہوئے نگاہیں نیچی کئے چینی کی پتلی منقش پیالی میں جوہی کی مہک میں غلطاں چائے پیش کر رہی تھی اور وہ اسکی آنکھوں میں وقت کی اس نیلے پتھروں والی محراب کو دیکھ رہا تھا جو ہاں اور ناں میں، عدم اور وجود میں ماضی اور مستقبل میں ایک پل کیطرح ہے۔ یکایک سندھیا نے آنکھیں بند کرلیں اور معاً چتا کیساتھ ساتھ اسکا گھر بھی جل گیا اور دلیپ نے محسوس کیا کہ وہ اس جلے ہوئے ٹیلے پر اکیلا کھڑا ہے۔

وہ آہستہ سے اٹھا۔ اپنے گھٹنوں کو اپنے بازوؤں کا سہارا دیکر اسی ٹیلے سے اٹھ کھڑا ہوا جہاں وہ پچیس سال سے اکیلا آتا تھا۔ کیونکہ اسنے محسوس کر لیا تھا کہ زندگی کے اس مشترکہ سفر میں کہیں پر کوئی ایک غم ہے جو بانٹا نہیں جا سکتا اور کوئی ایک ایسا سکھ ہے جسمیں کسی کو حصے دار نہیں بنایا

جا سکتا۔ اسلئے وہ ہر شام چند منٹوں یا چند گھنٹوں کیلئے یہاں اکیلا آتا تھا اور اسکے خاندان والے فارم پر کام کرنیوالے ساتھی بھی اسکے جذبہ کا احترام کرتے تھے اور اسے اکیلے اس ٹیلے پر آنے دیتے تھے۔ جہاں سندھیا نے اور اس نے مشترکہ گھر کا خواب دیکھا تھا۔

وہ خواب تو پورا نہ ہوا اور اس خواب کی قربانی اس لئے دی گئی تاکہ دوسرے بہت سے خواب پورے ہو سکیں۔ ان پچیس سالوں میں وادی کے کتنے ہی سپنے سچے ہو چلے تھے۔ پالن گڈھ کا فارم علاقہ کا سب سے سرسبز اور زرخیز فارم سمجھا جانے لگا۔ نئے اسکول کھل گئے۔ نئے گھر بن گئے گھروں میں بجلی آ گئی اور کسانوں کی آنکھوں میں نئی چمک۔ ان پچیس سالوں میں محنت کرتے کرتے اسکی کنپٹیوں پر چاندی کے سے بال چمکنے لگے تھے مگر وہ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی محنت سے خوش تھا۔ اس کی وادی گلزار بن گئی تھی۔

آج فارم کی پچیسویں سالگرہ کا جشن تھا۔ اسکے خاندان والوں۔ کسانوں اور ساتھیوں کے بچے اسے لینے کیلئے ٹیلے کیطرف دوڑے دوڑے آ رہے تھے۔ صاف ستھرے اجلے کپڑے پہنے ہوئے یہ تندرست بچے کتنے خوش معلوم ہو رہے تھے آج اگر سندھیا زندہ ہوتی تو ان بچوں میں اسکے اپنے بچے بھی ہوتے۔ اس خیال کے آتے ہی اسکے دل میں ایک میٹھا سا درد کروٹ لینے لگا اور اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اسے معلوم تھا کہ جسطرح اسکی ٹانگ کے اندر کہیں پر گوشت کی پرتوں کے اندر بلرام سنگھ کی گولی باقی ہے اسی طرح زندگی کی بہت سی کامرانیوں کے اندر کہیں پر اسکی محبت کا زخم رستا ہے جو کبھی مندمل نہ ہو سکے گا۔ لیکن وہ بچوں کی خوشی کو اپنے ذاتی غم سے ملوث نہ کرنا چاہتا تھا۔

اسلئے جب بچے اسکے قریب آ گئے تو مسکرا کر اس نے انہیں اپنے سینے سے لگا لیا۔ اپنے کندھے پر چڑھا لیا۔ اور پھر انکے ہاتھ پکڑ کے اور ان کیساتھ جشن میں شرکت کرنے کیلئے روانہ ہو گیا۔ سر اونچا کئے افق کی جانب دیکھتے ہوئے تاکہ اس خوشیوں بھرے میلے میں کوئی اس کے آنسو نہ دیکھ سکے ــــــ!

خــتم شد